فکرِ اقبال کا ترجمان

میرا پیام

(۱۱)

مدیر

پروفیسر عبد الحق

وائس چیئرمین

اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ

ناشر	:	اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی
اشاعت	:	نومبر ۲۰۱۹ء
قیمت	:	۱۰۰؍ روپے
پریس	:	اصیلا پریس دریا گنج، نئی دہلی

MERA PAYAM

Iqbal Academy (India)

Cisrs House, 14 Jangpura B.

Mathura Road, New Delhi

November 2019

ترتیب

ڈاکٹر سید ظفر محمود	حرفِ آغاز	۴
پروفیسر عبدالحق	عرضِ حال	۵
پروفیسر غضنفر	محبت ہوا کی طرح پھیل جائے	۶
پروفیسر عبدالحق	فلسفۂ خودی کے چند امتیازی نکات	۱۱
ڈاکٹر بشریٰ شریف	خطباتِ اقبال کے تراجم	۲۰
نسیم عباس چودھری	قرۃ العین حیدر پر اقبال کے اثرات	۳۲
ڈاکٹر نفیس حسن	فکرِ اقبال کی اسلامی اساس	۴۸
ڈاکٹر نسرین بیگم	اقبال کا پیغام محبت	۵۵
ڈاکٹر عبدالحئی	فکرِ اقبال کا اساسی پیغام	۶۰
ڈاکٹر محمد شاہد خاں	اقبال کے سیاسی افکار کی تفہیم	۶۶
ڈاکٹر اکبر حیدری مرحوم	ڈاکٹر اقبال اور پروفیسر رشید احمد صدیقی	۷۵
سید غلام سمنانی (مرحوم)	مسجد قرطبہ کی واپسی	۸۱
ڈاکٹر محمد شاہد (تبصرہ)	اقبال کی فکری سرگذشت	۸۵

حرفِ آغاز

اقبال اکیڈمی علامہ کے فکر و پیام کی ترسیل و اشاعت میں اپنی بساط کے مطابق مصروفِ کار ہے۔ ہم کسی بڑی مبہم کے نہ مدعی ہیں اور نہ ہی علم دار۔ اپنے محدود وسائل کے ساتھ اپنی کارکردگی پر اکتفا کرتے ہوئے جو بن پڑ رہا ہے اسے سنجیدگی سے انجام دینے میں کوشاں ہیں۔ بے حد خوشی ہے کہ ایک حلقہ ہمت افزائی کے لیے اخلاص و عمل کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے۔ یہی ادارے کی سعادت ہے اور سرفرازی بھی رسالے کے قارئین کی دل داری اور جان نوازی بھی سرشار کرتی ہے۔ اس اشاعت کو جاری رکھنے اور زیادہ سے زیادہ اقبال شناسوں کو حلقۂ درویشاں میں شامل کرنے کی خواہش میں قارئین کرام کے ارشادات رہبری کرتے ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں کے علاوہ بیرونِ ملک کے قاری بھی اپنے مشوروں سے نوازتے ہیں۔ ادارہ بڑے اہتمام سے انہیں گوہرِ شاہوار سمجھ کر اپنے کشکول میں محفوظ کر کے عمل پیرائی کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شمارہ بھی حسب سابق گراں قدر مضامین اور معلومات سے مزین ہے۔ نئے لکھنے والوں کے اقبالیاتی ذوق کو آفریں باد کہتا ہوں اور ان کے تازگی علم و قلم کے لیے دعا گو ہوں۔ رسالے کی اشاعت قلم کاروں کے تعاون پر منحصر ہے۔ بے مثل اور مایۂ ناز ناول نگار قرۃ العین حیدر کے فکر و فن پر علامہ کے اثرات کی نشان دہی ایک حیرت خیز مطالعہ ہے۔ اسی طرح علامہ کے بہت محترم دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ذاتی تعلقات پر ایک مقالہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

سید ظفر محمود

عرضِ حال

'میرا پیام' کا تازہ شمارہ پیش کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اقبال فہمی کی طرف ادارہ اور قارئین سنجیدگی سے گامزن ہیں۔ ان قلم کاروں کا احسان ہے جو اپنی نگارشات سے نوازتے ہیں۔ انہیں کی بدولت قارئین کے حلقے تک ہماری رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ذی فکر اور ذی علم مصنفین کا ایک حلقہ اپنے بھرپور قلمی تعاون سے ہماری ہمت افزائی میں مصروف ہے۔ ان میں بیش از بیش جواں سال اہل علم ہیں۔ بزرگوں کے ارشادات بھی اس جریدے کی توقیر میں اضافہ کررہے ہیں۔ میرا پیام کے اولین مخاطب کالج اور دانش گاہوں کے طلبا و اساتذہ تھے۔ یہ رسالہ اب دینی درس گاہوں میں درس و تدریس سے وابستہ عزیزوں اور بزرگوں کی پسند کا محور بنتا جارہا ہے۔ ادارے کو اطمینان ہے کہ ہم اقبال کے پیغام کی اشاعت و توسیع کے لیے ہمہ وقت ہر امکانی جہت پر نظر رکھتے ہیں۔ غیر معمولی دشواریوں کے باوجود جریدے کی اشاعت اور معیار کو برقرار رکھنا واجب سمجھتے ہیں کبھی کبھی تاخیر اشاعت سے تکلیف ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے بہ قول مادرانِ دختر ایام کے چھوٹے بڑے آفات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ملک و بیرون ملک کے معاملات کی ناخوش گواری بھی معمولات کو متاثر کرتی ہے۔ مزاحمتوں سے نبرد آزما ہونا ہی دردِل کی کشاد ہے۔ یہی نقطۂ ایماں کی تفسیر بھی ہے۔ اسی کے سہارے ارض و سما یا قلب و نظر کے فسق و فساد سے آرامِ جاں کا میسر آنا ممکن ہے۔ پیام اقبال کی یہی روح ہے اور انوار کی جلوہ گاہ بھی ہے۔ قارئین کے قلب و نگاہ کو علم و عرفاں کی روشنی فراہم کرنا اس جریدہ کا مقصد اور مبارک مشن ہے۔ جو قلب کو
گرمانے اور روح کو تڑپانے کا باعث بھی ہے۔ علامہ نے بھی یہی دعا مانگی تھی۔

اس شمارے میں نئے معاون قلم کاروں کی نگارشات شاملِ اشاعت ہیں۔ جن میں کلامِ اقبال کو نئے زاویہ سے مطالعہ کی کوشش ہے۔ اقبالیات میں ان کی شمولیت بہت خوش آیند ہے اور دل فروز بھی۔ ڈاکٹر نفیس حسن، ڈاکٹر نسرین بیگم، ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ادارے کو اپنے قلمی تعاون سے نوازا۔

سید غلام سمنانی مرحوم دہلی یونی ورسٹی میں ایک بہت ہی لائق اور صاحب علم انگریزی کے استاد تھے، مسجد قرطبہ کے داگذاشت ہونے کی خبر سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ نظم تخلیق کی تھی۔ تبریک کے طور پر اسے نقل کیا گیا ہے۔ نظم ہر اعتبار سے قابلِ رشک ہے۔

عبدالحق

پروفیسر غضنفر

محبت ہوا کی طرح پھیل جائے

جب کوئی متین و معتبر اور معروف و ممتاز مہتمم محفل یا منتظمِ مجلس کسی مذاکرے یا مباحثے کے لیے کوئی موضوع یا مضمون منتخب کرتا ہے تو اسے معلوم رہتا کہ اس متن کی ماہیئت ،معنویت اور مقصدیت کیا ہے؟ اگر وہ کوئی فلسفیانہ نکتہ ہے تو اسے پتا ہوتا ہے کہ اس نکتے میں کتنے نقطے ہیں؟ کس نقطے میں کون سی آواز پوشیدہ ہے؟ وہ آواز کون سے بول سناتی ہے؟ کیا معنی بتاتی ہے؟ کیا مفہوم سمجھاتی ہے، سماعت میں کیا کیا لاتی ہے؟ بصارت کو کیا کیا دکھاتی ہے، اسے علم ہوتا ہے کہ اس نکتے کے کیا کیا نقوش ہیں؟ ان نقوش میں کیسے کیسے رنگ ہیں؟ ان رنگوں کا کیا کیا ڈھنگ ہے؟ ان رنگوں میں دمکانے والے ریزے ہیں یا بجھانے والے؟ مرجھانے والے یا کھلانے والے؟ جگانے والے یا سلانے والے؟ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوتا ہے کہ اس نکتے تک کوئی مفکر کیوں کر پہنچا؟ اگر وہ موضوع کوئی مسئلہ ہے تو مہتمم یہ علم رکھتا ہے کہ وہ مسئلہ کس مدبر یا مصلح قوم کو سنگین کیوں لگا؟ اس کی سنگین نے کیا کیا اور اس سنگینی کے اثرات سے نجات پانے کے لیے اس نے کیا کیا؟ کس کس طرح کے راستے اختیار کیے؟ کون کون سے اقدامات کیے؟ زیر بحث مضمون اگر کوئی مرض ہے تو وہ کس حد تک مہلک ہے؟ معالجین نے اس کی تشخیص کی ہے یا نہیں؟ کی ہے تو اس تشخیص کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ہوا ہے تو وہ نسخہ کیا ہے اور وہ کس حد تک کارگر ثابت ہوا ہے؟

اس سیمینار کے لیے اقبال اکادمی کے عالم و فاضل عہدہ داران نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ ایک فلسفیانہ نکتہ بھی ہے، ایک معاشرتی مسئلہ بھی اور ایک ملی بیماری بھی۔ یہ موضوع ہمارے سامنے ایک شعر کی شکل میں رکھا گیا ہے۔ اس شعر کے انتخاب میں اراکین اکادمی کے ذہن میں یہ بات رہی ہوگی کہ شاعر تصویر درد کی مصوری کرتے وقت اس نتیجے پر کیوں کر پہنچا کہ ؎

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے\
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

موضوع پر تبادلۂ خیال کے دوران معلوم ہوا کہ اس شعر کے انتخاب میں اکادمی کے عہدہ داران میں شامل دو دانشوروں کا ہاتھ ہے جو قوم و ملت کے مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور مداوائے دردِ قوم دل و جان سے چاہتے

ہیں۔ان میں سے ایک کی نظر قوم وملت کے معاشرتی حالات، ان حالات سے پیدا شدہ نفسیات و کیفیات، ان کے اسباب ومحرکات، ملک کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی صورت حال، اندرونی جوش وابال اور بیرونی مکڑ جال پر پہنچتی ہیں اور باریک بینی سے دیکھتی ہیں تو بہت سے حیرت انگیز مناظر پاتی ہیں۔دیدوں میں ایسے حیران کن ۔

گلاب ٹہنی سے ٹوٹا زمین پر نہ گرا
کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر ہیں

پیکرا بھرتے ہیں اور سطح حقیقت پر تہوں میں رہنے والے ایسے ایسے حقائق کو لاتے ہیں جنہیں دیکھ کر پتلیاں حیرت واستعجاب میں گڑ جاتی ہیں۔تہوں سے جو مناظر باہر آتے ہیں وہ کچھ یوں ہوتے ہیں ۔

کسی کے دل میں بھی نفرت نہیں ہے
عداوت ، بغض ، کینہ کچھ نہیں ہے
کوئی ایسا نہیں جو چاہتا ہے کان میں اس کے
کسی کی آہ و زاری اس کے سینے میں اتر جائے
کسی کی سسکیوں کی گرمیوں سے جاں جھلس جائے

مگر سطح پر جو دکھائی دیتے ہیں انہیں دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے ۔

تو پھر کیوں مارتے ہیں، کاٹتے ہیں، بستیاں ویران کرتے ہیں
در و دیوار کو سنسان کرتے ہیں
خود اپنے آپ کو حیوان کرتے ہیں
خود اپنی آنکھ کو حیران کرتے ہیں

غور کرنے پر یہ مفصل جواب ملتا ہے۔

کہیں کچھ ہے جو برپا ذہن میں ہیجان کرتا ہے
سکوتِ زیست کو طوفان کرتا ہے
شعور وعقل کو بے جان کرتا ہے
دلِ معصوم کو شیطان کرتا ہے
کوئی طاقت ہے جو ادراک کے اوپر مسلط ہے
کوئی طاقت کہ ذہن وفہم پر جس کا تسلط ہے

وہ جذبہ ساحر الموط ہے ، جادو چلاتا ہے
ہمیں برگ حشیش ، صورتِ شربت پلاتا ہے

بے چین ہو کر جب وہ یہ صورت حال اپنے رفیق کار یعنی دوسرے اہم اور ذمے دار عہدے دار کے سامنے رکھتا ہے تو وہ بھی مضطرب ہو اٹھتا ہے۔ حالتِ اضطراب میں اس کا ذہن وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اس طرح کی صورتِ حال پہلے سے موجود ہے جو ماضی میں بھی اپنی سنگینی دکھا چکی ہے۔ نئی نئی مصیبتیں لا چکی ہے۔ وہاں یہ صدا بھی گونج رہی ہوتی ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اکادمی کا وہ عہدہ دار اس صورتِ حال سے مضطرب ہوتا ہے اور جس کی نظر ماضی کی طرف پلٹتی ہے۔ وہ وادیِ افکار اقبال کے چپے چپے سے واقف ہے۔ اسے اقبال کے ایک ایک سوچ، ایک ایک فکر، ایک ایک فکر، ایک ایک نکتہ، ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک حال کا علم ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس مفکرِ قوم نے مشرق ومغرب کے مسئلوں کو کہاں کہاں اور کس کس طرح سے پیش کیا ہے اور اس دردمند اور غم خوارِ قوم مدبر کے نزدیک ان مسئلوں کا حل کیا ہے؟ اس کی سماعت اقبال کی اس صدائے پرسوز سے آشنا ہے کہ جب چمن کے مختلف پرندوں جیسے قمریوں، طوطیوں اور عندلیبوں نے مل کر طرزِ فغاں لوٹی تو چمن کی آواز کا کیا حال ہوا؟ وادیِ افکارِ اقبال کے مختلف راستوں سے واقفیت رکھنے والے اس شخص کو اس موجودہ مسئلے کے حل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی اور اس کی نظریں بہت جلد تلاش کر کے اس حل کو سامنے رکھ دیتی ہیں۔

محبت سے ہی پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اس شعر کو سنتے ہی بیمار قوموں کی داستانیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ شکنجے میں چھٹپٹاتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے۔ کراہیں اور آہیں باہر آتی ہیں۔ دھند بھری راہیں اور بے بس نگاہیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ وحشت ناک اذیتیں اور کربناک کیفیتیں آنکھوں میں سمٹ آتی ہیں اور پھر وہ نسخہ بھی سامنے آجاتا ہے جسے مسیحا ڈاکٹر اقبال نے کافی غور وخوض

کے بعد دریافت کیا۔ یہ ایسا نسخہ تھا جس سے بیمار قوموں نے صرف شفا ہی نہیں پائی بلکہ اس تیر بہ ہدف نسخے سے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار بھی کیا۔ اس نسخے پر حکیم وقت سر محمد اقبال کو اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے بار بار اس کا ذکر کیا۔ مختلف انداز سے اس کی خوبیوں کا بکھان کیا۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے
شرابِ روح پرور ہے ، محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا
شکتی بھی شانتی بھی ، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پر یت میں

ان دونوں دانشوروں کو شدت سے یہ محسوس ہوا کہ علامہ اقبال نے جو نسخہ تجویز کیا ہے اسے عام کیا جائے۔ اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا جائے۔ اس جاں فزا نسخے کو مشتہر کیا جائے۔ اسے ایک ایک مریض تک پہنچایا جائے تا کہ کراہتا ہوا انسان اور مرتی ہوئی انسانیت درد وکرب سے نجات پا سکے۔ تکلیفیں دور ہو سکیں۔ وہ آرام پا سکیں۔ ان دونوں دردمندوں نے اس حقیقت کو شدت سے محسوس کیا کہ قوموں کی بیماری کا یہ نسخہ ہی واحد علاج ہے۔ چنانچہ اس نسخے کی تشہیر کے لیے ایک محفل سجادی۔

اس نسخے کی معنویت اور اثریت کو صرف ڈاکٹر محمود اور ڈاکٹر عبدالحق ہی نہیں سمجھتے بلکہ آج کے دوسرے باخبر شاعر و ادیب بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے انداز سے وہ بھی اس نسخے کو عام کرنے کا جتن کرتے ہیں، چنانچہ مثنوی کربِ جاں کا شاعر لکھتا ہے۔

محبت ہٹاتی ہے رستے سے خار — محبت سے بنجر زمیں سبزہ زار
محبت کھلاتی ہے صحرا میں پھول — محبت سے بنتا ہے بیلا ببول
محبت سے نفرت کے جھڑتے ہیں خار — عداوت کے چھٹتے ہیں گرد وغبار
محبت سے پتھر کا سینہ کٹے — محبت سے کوہِ گراں بھی جھکے
محبت کا تیشہ کرشمہ کرے — ندی دودھ کی پتھروں سے بہے
محبت مسرت کا نشہ پلائے — محبت سے آنکھوں میں مستی سی چھائے

محبت فضاؤں کو گل سے سجائے　　محبت ہواؤں میں خوشبو بسائے
محبت سے ساری فضا گنگنائے　　محبت سے اک اک بشر کھلکھلائے
محبت بنے ایسی بادِ بہار　　نکھر جائے گلشن کا ہر برگ وبار
محبت سے فولاد بن جائے موم　　نکل جائے اعلیٰ دماغی کا زعم
محبت محبت کے جھولے جھلائے　　محبت ہوا کی طرح پھیل جائے

خدا کرے یہ جلسہ بابرکت ثابت ہواور محبت عام ہو جائے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ

محبت پر نہ ہرگز فتح پائی ابنِ آدم نے
کہ نفرت آج بھی انسان سے انسان کرتے ہیں

لیکن اس حقیقت کو اگر ذہن نشین کر دیا جائے کہ

پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں　　ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے

اور ایک ایک فرد یہ عزم کرلے کہ

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

تو محبت پر پھر سے فتح پائی جاسکتی ہے۔

پروفیسر عبدالحق

فلسفۂ خودی کے چند امتیازی نکات

(فارسی شاعری کے حوالے سے)

خودی فکرِ اقبال کا نقطۂ نور ہے جو نورِ کبریا سے فروزاں ہوتی ہے۔

خودی روشن زنورِ کبریاست

یہ اقبال کی اجتہادی فکر کا بہت ہی معروف اور اساسی پہلو ہے اور ان کی شخصیت میں محلول کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کی شناخت کی نسبتیں خودی سے وابستہ ہیں خودی بھی اپنے تعارف و تجزیہ کے لیے اقبال کی مرہونِ نظر ہے۔ گویا دونوں من وتو میں مدغم ہیں۔اقبال نے خودی کے تعارف میں لکھا ہے:

> ''یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔''

خودی کے مختلف زاویہ اور صفات ہیں جو اقبال کی تحریروں میں فکری شہ پارے بن کر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس اساسی فکر کی بہت کچھ مربوط اور منظّم صورت ان کے پہلے شعری مجموعہ اسرارِ خودی (مطبوعہ ۱۹۱۵ء) میں ملتی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ 'رموزِ بیخودی' ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ان کی اشاعت اور علامہ کی وفات کے درمیان بیس سال کا وقفہ ہے۔اس وقفے میں ارتقائے خیال یا انحراف عین ممکن ہے۔خودی سے متعلق دوسرے تصورات کا در آنا ناگزیر فطری عمل تھا۔اشعار میں بہت سے نئے خیالات کا اظہار ہوا جو اسرار خودی میں تخلیق کا حصہ نہ بن سکے تھے۔لیکن ان تخلیقات کے روبرو اردو میں ایک نظم بھی نہیں ہے۔اردو میں خودی سے متعلق کافی اشعار ہیں جن میں نئے نکات ہیں۔ مطالعۂ اقبال کی مجبوری ہے کہ ہم کسی ایک کتاب یا تخلیق پر تکیہ نہیں کر سکتے۔ان کے افکار کی تفہیم کے لیے تمام تحریروں کو پیش نگاہ رکھنا لازم ہے۔اور یہ تحریریں انگریزی اردو فارسی یا نظم ونثر کی پابند نہیں ہیں نثر میں بھی کئی ایسے نادر خیالات قلم بند ہیں جو نظم میں ناپید ہیں۔معاملہ فکر وفلسفہ کے مختلف موضوعات کا ہے۔صرف اسالیبِ بیان وابلاغ کا نہیں ہے۔اسی سبب ہر پارۂ تحریر وتقریر کی اہمیت ہے۔بعض اہم پہلو خطبات میں موجود ہیں جو شاعری میں نہیں آ سکے ہیں۔

افکار کے غیر معمولی نکات سے معمور اشعار کی مدد سے اسرار ورموز کو مزید مربوط کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ان

اشعار کے بغیر خودی وبیخودی کی تفہیم مکمل نہیں ہوسکتی ۔ یہاں ان اشعار یا افکار سے سروکار نہیں ہے ۔ بلکہ خودی سے متعلق وہ زاویے پیشِ نظر ہیں جو اردو میں منتقل نہ ہو سکے ۔ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسرارِ خودی کو نظر انداز کر کے فلسفۂ خودی کا ادراک ممکن نہیں ہے یہاں فارسی میں موجود چند اہم نکات کی نشان دہی مقصود ہے جو اردو میں رقم نہ ہو سکے۔ کچھ اشعار میں اشاروں کا ذکر تاویلات کے سہارے بیان ہوسکتا ہے۔

شعورِ ذات کے لیے اقبال نے ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ ہم بود و نبود سے اگر بے نیاز بھی ہو جائیں تو درونِ دل کی ایک فطری آواز ہمارے وجود کے اثبات کے لیے مسلسل صدا دیتی رہتی ہے ۔ جو خودی کا نقشِ اولیں ہے ۔ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد کا شعر ہے اور پیام مشرق کے 'لالہ طور' کی رباعیوں میں شامل ہے ۔

من از بود و نبود و خود خموشم　　　اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادہ کیست　　　کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

گویا خودی ایک فطری آواز ہے جو وجود سے وابستہ ہے اور ہر لحہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے ۔ یہ خیال ہو بہو صورت میں اردو میں نہیں ہے اور نہ ہی اسرار کے مقدمات میں موجود ہے ۔ اس فطری آواز کے ادراک کے لیے اپنی خودی کی تحقیق میں گم ہونا پڑے گا۔ اس کی تصدیق گلشنِ راز کے آٹھویں سوال کے آخری شعر سے ہوتی ہے۔

بخود گم بہر تحقیق خود ی شو　　　انا الحق گوئے وصدق خودی شو

اسرار کے شروع میں مولانا رومی کے تین اشعار پیش نامہ کے طور پر نقل کیے گئے ہیں ۔ یہ اقبال کو اتنے پسند ہیں کہ یہ اشعار جاوید نامہ کے شروع میں تمہید زمینی کے ذیل میں غزل کے آخری اشعار کے طور پر داخل متن ہیں اردو میں مولانا رومی سے نیازمندی کا بار ہا اظہار ہوا ہے مگر اشعار کا تکرار کے ساتھ استعمال نہیں نظر آتا۔ اس پیش نامہ کے بعد اسرار کا آغاز نظیری نیشاپوری کے شعر سے ہوتا ہے۔

نیست خشک وتر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اقبال کو نظیری نیشاپوری سے خاص نسبت ہے ۔ راقم کا خیال ہے کہ اقبال نے نظیری کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ رومی کو بھی نذر نہ کر سکے ۔ رومی پر ہی موقوف نہیں بلکہ کسی شاعر یا مفکر کو یہ ہدیۂ عقیدت منسوب نہ کر سکے ۔ نظیری کے ایک مصرع پر ملکِ جم کو قربان کرنے والے اقبال ہیں ۔ نظیری کو اقبال جیسا دوسرا قدر دان بھی نہ مل سکا۔ اس مصرع کی داد بھی اقبال ہی دے سکتے تھے ۔ جو ان کی انقلابی فکر کا نقطۂ آغاز ہے ۔

بملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

اقبال کو یہ شعر اتنا عزیز ہے کہ اسے تکرار کے ساتھ کلام میں جزوِ تخلیق بنایا ہے۔خودی کفن و کافور سے بے نیاز ہے وہ شہادت گہِ زندگی کی آزمائش میں خاک وخوں سے تڑپنے پھڑکنے کی طلب گار ہوتی ہے۔ پیام مشرق کی غزل کے علاوہ جاوید نامہ میں نوائے حلاج میں دوسری بار اس قول کو نظم کیا گیا ہے۔

اسرارِ خودی میں تمہید کے بعد تیسرا عنوان ہے کہ خودی کو عشق ومحبت سے استحکام حاصل ہوتا ہے اور اس عشق کا سرچشمہ قلبِ انسان ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت

یہ تمام اشیائے کائنات سے خوب تر محبوب کا مسکن ہے۔

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰؐ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ است

ذاتِ گرامیؐ سے متعلق حکمت ودانائی سے سرشار یہ پینتالیس اشعار پر مشتمل تفصیلی تذکرہ اردو میں نہیں ہے۔فلسفۂ خودی کی یہ نسبت بھی اتنی وضاحت سے کہیں موجود نہیں ہے۔

خودی کے ایوان فکر کے تین ستون ہیں جن پر اس نظامِ فلسفۂ کی بنیاد ہے۔اقبال نے انہیں تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔اطاعت ضبط نفس اور نیابتِ الٰہی خودی کے اساسی ارکان ہیں۔ان مرحلوں کا اشارہ اردو شاعری میں نہیں ملتا۔خودی کی تفہیم کے لیے فارسی شاعری سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔مرحلۂ سوم کے آخری اشعار میں کسی مردِ غیب کی آمد کی آرزو کی گئی ہے۔اردو میں ان صفات کے ساتھ یہ آرزومندی مفقود ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خو درا بہشت گوش کن
خیز وقانون محبت سازدہ
جام صہبائے محبت باز دہ

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

اقبال مہدیٔ موعود کے منتظر نہیں بلکہ واہمہ گردانتے ہیں مگر مردِ خودی کے استقبال میں فرشِ راہ نظر آتے ہیں۔ اس آرزو کا ایک سر رشتۂ صفات مردِ مومن سے بھی ملتا ہے۔

خودی کا خارجی پیکر مرد کامل ہے جو اعلیٰ ترین اقدار کا حامل اور ان کی نگہبانی کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ ان اقدار میں قدر اول حضور سرورِ کائناتؐ سے عشق وعقیدت ہے۔ اسی سے خودی کو استحکام واستقرار حاصل ہوتا ہے۔ یہی عشقِ رسالت مآبؐ اقبال کے فکر وشعر کا جوہر ہے اور عرض بھی ہے۔ یہی فلسفہ وفن میں روحِ روانِ قلب ونظر اور تمام تصورات کا مصدر ہے۔

اس موضوع کا اعادہ اسی حقیقت کا مظہر ہے رموز میں ملت کے لیے توحید ورسالت کو اساس اور لازم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کو آئین ملت کا نظامِ حیات بتایا گیا ہے۔ آدابِ محمدؐ ملت کے حسن سیرت کا مرکز محسوس قرار دیا ہے۔

طینیت ِپاک مسلماں گوہر است
آب وتابش از ہم پیغمبرؐ است

دینِ مبین سے وابستہ دوسرے عنوانات کے بعد آخری حصہ بحضورِ رحمت اللعالمینؐ میں ۱۶۵ اشعار پر مشتمل اقبال کا بے مثل عاجزانہ عرض ونیاز ہے جس میں پر سوز معروضات کے بعد اقبال اپنی لغزشوں پر شرم ساری کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو ملاحظہ ہو۔ یہ اعتراف بھی اردو میں نہیں ہے۔

ہست شانِ رحمتِ گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

اس تفصیل کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ خودی بے خودی کی بقا کا انحصار ذاتِ مقدسؐ سے پیوستہ ہے۔ اردو میں اشارے ہیں مگر یہ صراحتِ بیان نہیں ہے۔ فلسفۂ خودی کے مطالعہ کا یہ ایک بہت اہم عنوان ہے۔

خودی کو درونِ سینہ کی فطری آواز کہہ کر پہلا مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا استدلال بھی قابلِ غور ہے۔ اس شعور کے احساس کے لیے تین دیگر شہادتوں کو ضروری بتایا گیا ہے۔ جاوید نامہ کے شروع میں تمہیدِ زمینی کے ذیل میں ایک پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ روح رومی پردۂ غیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال استفسار کرتے ہیں کہ موجود ونا موجود کیا ہے۔؟ رومی جواب دیتے ہیں کہ موجود وہ ہے جس میں نمود یا آشکار ہونے کا اضطراب ہو۔ ہر حال میں اپنے وجود کی خود تشکیل وتکمیل کرنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی وجود کے اقرار کے لیے دوسروں کی شہادت بھی درکار ہوتی

ہے۔اس کی تمثیل روزِ الست کا پیمان وفا ہے۔

انجمن روز الست آراستند | بروجود خود شہادت ساختند
زندہ ٔ یا مردۂ یا جاں بلب | از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہد اول شعورِ خویشتن | خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگر ے | خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہد ثالث شعورِ ذات حق | خویش را دیدن بنورِ ذات ِ حق

گویا اپنی ذات کے عرفان کے لیے خود اپنے نور ونظر کی ضرورت ہے۔دوسروں کے شعور وعرفان سے اپنے وجود کو استقرار حاصل ہوتا ہے۔وجودِ حق کی تیسری شہادت ناگزیر ہے کیوں کہ اپنے وجود کے اثبات کے لیے نورِ کبریا کی تصدیق چاہئے۔ذاتِ حق کے نور کے بغیر اپنا عرفان ممکن نہیں ہے۔یہ وہ نکات ہیں جو اسرار میں نہیں ہیں اور نہ ہی اردو میں ذکر ہے۔فلسفۂ خودی کی تفہیم میں یہ پہلو نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

اس شعور وشاہد کی صفات کا مختصر ذکر گلشنِ راز کے سوال دو میں کیا ہے۔اس کی بے کران وسعتوں اور پہنائیوں کا بیان اس سلسلے کر مربوط کرتا ہے۔

حیات پر نفسِ بحر روانے | شعور وآگہی اورا کرانے
ہرآں چیزے کہ آید در حضورش | منور گردد از فیضِ شعورش
بخلوت مست وصحبت ناپذیر است | ولے ہر شے زنورش مستنیر است

یعنی ہر شے اس شعور سے منور ہوتی ہے۔گویا شعور بذات خود ایک سرچشمۂ نور ہے جس سے تمام عالم فروزاں ہوتا ہے بعد کے اشعار حکیمانہ آگہی کی دعوتِ دیتے ہیں۔

حدیثِ ناظر ومنظور رازے است | دل ہر ذرہ در عرضِ نیازے است
تو اے شاہد مرا مشہود گرداں | زفیضِ یک نظر موجود گرداں
کمالِ ذات نے موجود بودن | برائے شاہدے مشہود بودن
جہاں غیر از تجلی ہائے مانیست | کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

ناظر ومنظور اور شاہد ومشہود آگہی یا شعور کے فیضان ہیں اور ہر دو ایک گہرے ربط سے وابستہ ہیں۔اسی شعور سے عالم جہاں تاب ہے۔شعورِ ذات کا آتش کدہ عالم آب وخاک اور مکان ولامکاں کو تسخیر وتاراج کرنے کے لیے کافی ہے۔

چو آتش خویش را اندر جہاں زن
شبیخوں برمکاں و لامکاں زن

خودی کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اجتماعی خودی کا احترام کرتی ہے بلکہ وہ ملزوم حصہ ہے۔ جسے بیخودی کہتے ہیں۔لیکن اس کے اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کی گنجائش یا گزر ممکن نہیں۔گلشنِ راز جدید کے چوتھے سوال کے آخری شعر میں ذکر ہے۔

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است

اسی خودی کو غیر سے عشق بھی ناگوار ہے۔ وہ قبول کرتے ہیں کہ جو جمالِ ذات سے عشق کرتا ہے وہ جملہ موجودات کا سالار رہوتا ہے۔جاوید نامہ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را او ست سید جملہ موجودات را

اردو نظم تیاتر (ضربِ کلیم) میں ایک اشارہ ملتا ہے

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ

اس کا سیاق تمثیل یا ڈرامے سے ہے جس میں اپنے کردار و عمل سے کسی غیر کی ترجمانی کی جاتی ہے۔یہ بات اقبال کو پسند نہیں ہے کیوں کہ یہ ان کے فلسفۂ حیات کی نفی کرتا ہے۔ بہروپ بہرحال نفی ذات ہے۔اسی چوتھے سوال کے ایک شعر میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جلوت وخلوت میں نورذات کی ہی کارفرمائی ہے۔انجمن یا اجتماعیت میں ہی حیاتِ جاوداں ممکن ہے۔

بخلوت ہم بخلوت نورِ ذات است
میانِ انجمن بودن حیات است

اقبال نے تصورمملکت وامارت پر بڑے حکیمانہ نکات پیش کیے ہیں جس میں اطاعت و احکام کے افکار شامل ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ خودی ایک شعوری احساس کا نام ہے۔ یہ عمل کی رو سے خارجی پیکر اختیار کرتی ہے۔اس پیکر کا نام مردِ کامل ہے جو خودی و بیخودی سے سرشار عملِ پیہم کا متحرک مجسمہ ہوتا ہے۔ یہ وحی وتنزیل کا حامل ہے۔لیکن اگر کسی معاشرہ میں یہ موجود نہ ہوتو نظامِ مملکت کا کون سزاوار ہوسکتا ہے؟ اقبال کے پیشِ نظر معاشرتی تشکیل کا مسئلہ بہت اہم ہے۔اس پیچیدہ صورتِ حال کا جواز فکرِ اقبال میں موجود ہے۔اور صرف ایک بار بیان ہوسکا ہے۔یہ خیال نہ اسرار میں ہے اور نہ اردو میں 'جاوید نامہ' میں آنسوئے افلاک پر شاہِ ہمدان کی زباں سے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے۔اقبال شاہ ہمدان

سے استفسار کرتے ہیں کہ آئے مرشدِ معنی آپ تو سلطنت وشاہی کے راز داں ہیں۔اور میں درماندہ فقیرِ راہ نشیں ہوں۔حاکم خراج طلب کرتا ہے۔امارت وسیادت کی آخر حقیقت کیا ہے؟ یہ مکالمہ یا مخاطبت بہت ہی دلچسپ مگر انتہائی فکر انگیز ہے۔اقبال کے تصورات کی تفہیم کا سب سے اہم نکتہ ہے۔شاہ ہمدان کی زبان سے فکر کا یہ پہلو بیان ہوتا ہے کہ مشرق ومغرب میں حکومتوں کی بنیاد قوموں کی مرضی کے مطابق ہے یا پھر حرب وضرب کے نتیجے میں فاتح اقتدار پر فائز ہوتا ہے۔دو کے علاوہ کسی اور کی بادشاہی قابل قبول نہیں ہوسکتی اور نہ انہیں خراج دیا جاسکتا ہے۔اس سربراہ کی اطاعت واجب ہے جو آیات الٰہی کا نگہبان اور صاحبِ ایمان ہو۔ازروئے قرآن 'اولی الامر' کا مستحق ہو۔آیۂ حق اس کے لیے حجت ودلیل ہو اسی کی پیروی جائز ہے۔یا پھر ایسا جواں مرد ہو جو جلال وجمال کا پیکر خودشناس وخودنگر ہو۔کار زار میں شر کی قوتوں کا خاتمہ کرنے والا اور صلح وآشتی کے وقت دل داری ودلبری میں بے مثالِ پیکر امن والتفات ہو۔

فاش گویم باتو اے والا مقام — باج را جز با دو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ منکم شان اوست — آیۂ حق حجت و برہانِ اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز — شہر گیر و خویش باز اندر ستیز
روزِ کیں کشور کشا از قاہری — روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

کثرت وقلت کے درمیان ہم آہنگی کے لیے سب سے بہتر نظام کی یہی صورت ہے اور مملکتوں کی خوش حالی کا نسخۂ شفا بھی ہے۔گویا اقلیتوں کی فلاح ایسے امیر کی اقتدا میں ہے جو ہر طرح کے تعصّبات اور تنگ نظری سے پاک ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہو۔شورائی نظام کے تحت امیر کا انتخاب یا جلال وجمال کے پیکرِ بے مثال کی اطاعت اقبال کی سیاسی فکر کے پہلو ہیں۔گویا خودی وبے خودی کی صفات سے متصف انسان وقیادت کے لائق ہے خودی وبے خودی قوم وقبیلے یا تعصب وتنگیٔ قلب ونظر کی ہر قید سے آزاد ہے۔اسی سے مشتِ خاک کو فروغ نظر اور آسماں کے مطلعِ انوار تک رسائی ممکن ہے۔باشندۂ زمین سپہرِ نیل گوں کی بلندی کو زیر پر لاکر خلافت وامارت کا حق دار ہوسکتا ہے۔یہ ایک لسانی بوالعجی ہے کہ اردو کے دو عظیم شاعر غالب واقبال کا فنی منہاج فارسی میں ہے اور مقبولیت کا مدار اردو کا مرہون نظر ہے۔غالب اردو کو بے رنگ ہی کہتے رہے۔اقبال بھی اردو کو منت پذیر شانہ ہی سمجھتے رہے۔دونوں کی لسانی بصیرت خوش فہمی کی شکار ہوگئی۔وہ دیکھ رہے تھے کہ فارسی بیرونی زبان ہے اور تیزی سے مائل بہ زوال ہے۔مرکزِ اقتدار بھی متزلزل ہے۔اہلِ ایران اپنی کم نظری کی بنا پر ہندوستانی فارسی کو سبکِ ہندی کہہ کر اس کی تحقیر کرتے رہے۔غالب واقبال کو معلوم تھا کہ اردو عوامی ابلاغ کا ذریعہ بن چکی ہے۔اور فارسی کی جگہ لے چکی ہے۔فارسی میں شعر کہنے کا جواز نہ تھا اقبال کی خوش گمانی اور جذباتی تخاطب دونوں غلط تھے۔

عجم از نعمہ ٔ ہائے من جواں شد
ز سو دائم متاعِ او گراں شد

ان کو معلوم نہ تھا کہ عجم کا ہی نوجوان پوری اسلامی دنیا کو تہس نہس کرنے کے لیے مسلکی جنگ میں ملوث ہوگا اہل فارس کے غرور بے جا کی مکروہ مثالی خان آرزو اور علی حزیں کی معرکہ آرائی ہے۔ خود ہندوستانیوں نے بھی اقبال کو ایک زمانے تک نظرانداز کیا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے فارسی شاعری کا انتخاب دشمن زار ۱۹۶۸ء میں شائع کیا اور اقبال کو شامل نہیں کیا۔ دونوں فن کاروں نے اپنی زبان کا زیاں کیا اور اردو کی محرومیوں میں بھی اضافہ کیا۔ ورنہ ان کا سارا فارسی کلام آج اردو کا سب سے گراں قدر سرمایۂ سخن ہوتا درمیان میں یہ سخن گستری بے محل ہی سہی مگر ایک بڑی حقیقت ہے۔ فارسی کی برکتیں برحق مگر اس کے اندوہ ناک نقصانات بھی بے حد و بے حساب ہیں۔ وہ صدیوں تک سرکاری زبان رہی اور اردو کو پنپنے کا موقع نہ دیا۔ ایران ہی نہیں دور سے نسبت رکھنے والے ہندوستانی بھی اقبال کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ انہیں نے اقبال کو لائقِ گردن زدنی بھی قرار دیا ہے۔ یہ اقبال کی نہیں علم و ادب کی اہانت ہے جو ہنوز جاری ہے۔ پھر بھی فکر اقبال کے اقرار و اعتراف میں سارا جہان سرنگوں ہے۔

خودی کا ایک خارجی پیکر مردِ کامل ہے۔ جو عظیم مقاصد کے حصول میں ہمہ وقت مسلسل سرگرم عمل رہتا ہے انجام سے بے خبر مجاہد کا اضطراب اقبال کی زبان میں عشق ہے۔ جو مروجہ مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے ہزارون نام و مقام بے کراں وسعتوں کے حامل ہیں۔ اس کی جہات کا ایک پرتو مسجدِ قرطبہ میں نظر آتا ہے۔ عالم آب و خاک اسی سے فروزاں ہے۔ یہ عشق و عقل کا حریف نہیں اور نہ ہی متصادم ہے۔ اردو شاعری میں عقل کی عیاری یا محو تماشائے لب بام کا تصور عام ہے۔ فارسی شاعری میں اس کے برعکس دونوں کے گہرے ارتباط بلکہ ادغام کا بہت ہی فکر انگیز ذکر ملتا ہے۔ جو اقبال کی تعقل پسندی اور طرز کلام کی طرح داری کا روشن عنوان ہے۔ مقاصد کی تکمیل کیلیے عشق کا جوش و جنون ہی کافی نہیں۔ حکمت و دانائی اور تعقل و تفکر بھی لازم ہے۔ یہ جز و عشق کی مرکب اور مربوط صورت گری ہے۔ جو اقبال کو بہت عزیز ہے۔ اردو کے شعری حوالے سے اقبال کو عقل دشمن سمجھ لیا گیا۔ ترقی پسند تنقید نے اسے بہت ہوا دی ان نقادوں کی کم نگہی نے فارسی شاعری میں موجود افکار کی معنویت کو خاطر میں لائے بغیر اقبال کو خطاوار قرار دیا۔ اقبال فکر و فلسفہ کے شناور تھے انہوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھی۔ جس میں عقل و عشق کے اشتراک و ارتباط کو نظمِ عالم کی دائمی ابدی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ اقرار کرتے ہیں کہ جنوں کا ادراک اور فہم کی رسائی حاصل ہو تو جنوں کی قبا کا عقل کی قامت پر چست ہونا محال نہیں۔ افسوس ہے کہ زمانہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقت اورا

جنون قباست کہ موزوں بہ قامتِ خرداست

(پس چہ باید کرد)

دونوں کے اتصال پر جاوید نامہ میں ایک دوسرا نکتہ بیان کیا گیا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں

علم با عشق است از لاہوتیاں

علم عشق سے بے نیاز ہو کر فسادِ خلق کا سبب بن جائے گا اور اگر وہ عشق کا ہم نوا ہو تو بام گردوں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ خود شناسی یا حق شناسی کے لیے ان دونوں کی ہم آہنگی از بس ضروری ہے۔ جاوید نامہ میں مزید حوالہ ہی نہیں ہدایت اور تاکید بھی ہے۔

زیر کی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق باز یر کی محکم اساس

عشق چوں باز یر کی ہم برشود　　نقش بندِ عالم دیگر شود

خیز و نقش ِ عالم دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیز دہ

جاوید نامہ

دونوں کے اشتراک سے عالمِ نازاد کی تخلیق ممکن ہے۔ اٹھو اور ایک دوسری دنیا کی بنیاد رکھو عشق کو عقل میں تحلیل کر دو اگر حق شناسی اور محکم اساس کی آرزو رکھتے ہو۔ اقبال نے ایک دوسرا خیال افروز مقدمہ قائم کیا ہے جو اجتہادی فکر کا آئینہ اور دستورِ زندگی کا قبلہ نما ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے مستی و سرشاری کے شرر سے بزم کائنات کو روشن کیا ہے۔ عشق کو عقل کے نور سے منور کیا ہے۔ تو عقل کو عشق کا گدازِ قلب بخشا ہے۔

نوا مستانہ در محفل زدم من　　شرارِ زندگی بر گل زدم من

دل از نورِ خرد کردم ضیا گیر　　خرد را بر عیار دل زدم من

(پیامِ مشرق۔۱۳۹ رباعی)

یہ ایسے مباحث ہیں۔ جن کو تفہیم کے لیے فارسی شاعری کا مطالعہ ناگزیر بن جاتا ہے فکر اقبال اپنی دیریابی و دل کشی کی تمام رعنائیوں کے ساتھ ان بکھرے خیالات کے مجموعی مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ تاکہ ارتکازِ فکر تک رسائی ہو۔ ان چند نکات کے علاوہ اور بھی بہت سے گوشے ہیں جو فارسی شاعری کو اردو سے ممتاز کرتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

ڈاکٹر بشریٰ شریف
گورنمنٹ کالج
لاہور

خطباتِ اقبال کے اردو تراجم کا تعارف

اسلامی فکر کی تشکیل نو کے موضوع پر دیئے گئے اقبال کے خطبات کو بلا شبہ ان کا فکری کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دور بالخصوص مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم دور تھا جب وہ برطانوی امپیریلزم کے تحت مختلف سیاسی وسماجی چیلنجز کا سامنا کر رہے تھے۔ اقبال نے نہ صرف ان چیلنجز کو قبول کیا بلکہ عصری فکر کی روشنی میں اسلامی الہیات کو مرتب صورت میں قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اقبال کے افکار، حیات کو کوتاہی وتساہل پسندی کی تاریکی سے کھینچ لانے اور دلِ زندہ میں عمل کی جرأت پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال کے خطبات کے موضوعات اپنی ماہیت، جامعیت اور معنویت کے باعث، حیات کی تساہل پسندی لاپرواہی، کوتاہی اور بے عملی سے کوہ کنی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

خطبات کے مطالعے کو عام کرنے کی ضرورت اس اعتبار سے بھی محسوس کی جا سکتی ہے، کہ آج پینسٹھ برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مملکت خداداد بحیثیت ایک آزاد مملکت آج جن مسائل سے دوچار ہے، ان میں خطبات پر غور وفکر سے بہت سی صحت مندانہ راہیں نکل سکتی ہیں۔ آج کے مسائل کا حل صرف اور صرف اسلام کے بنیادی اور آفاقی اصولوں کو عصری تقاضوں کے پس منظر میں دریافت اور متعین کرنے کی ضرورت میں ہے۔ بنیادی طور پر اسلام کے بنیادی اور آفاقی اصولوں کے پیش نظر ٹھوس معاشرتی داروں کی از سر نو دریافت اور اس انداز سے تجدید کرنا باقی ہے کہ معاشرتی زندگی اپنے جوہر میں اسلامی رہتے ہوئے، اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم قوم کو اقوام عالم اور عالمی برادری کے دوش بدوش چلنے کے لائق ہو سکے۔

خطبات کے تراجم دنیا کے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، تاہم مقالہ ہذا میں ان کے اردو تراجم وتوضیحات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ خطبات کی پانچ مکمل تراجم اور اٹھارہ توضیحات وتسہیلات کے علاوہ، انفرادی خطبات سے متعلق براہ راست اور ضمنی مضامین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک سید نذیر نیازی کے ترجمے ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کا تعلق ہے، تو ان کا ترجمہ اپنی جامعیت، معنویت اور آفاقیت کے باعث اہمیت کا حامل ہے۔ خطبات کے تراجم سے قبل سید نذیر نیازی نے ۲۷ صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں خطبات کے تراجم کے پس منظر اور اس کی

ضرورت واہمیت کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ سید نذیر نیازی نے مقدمے میں واضح درج کیا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں خطبات کے پہلے مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی علامہ نے انہیں ڈاکٹر عابد حسین کی خدمت میں ترجمے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے روانہ کیا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی مصروفیت کے سبب یہ ذمہ داری، سید نذیر نیازی کو اٹھانا پڑی۔

ترجمے کا آغاز ۱۹۳۰ء میں اقبال کی رہنمائی میں ہی ہوا۔ سید نذیر نیازی کے ترجمے کے ابتدائی کلام کی علامہ نے نہ صرف خود نظر ثانی کی، بلکہ بعض الفاظ، اصطلاحات اور عبارت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انہیں ترجمے کے کام کو جاری رکھنے کا حکم بھی دیا۔ سید نذیر نیازی نے ترجمے کے اجزا کو علامہ کی ہدایات کے مطابق مولانا محمد السورتی، مولانا اسلم اور ڈاکٹر عابد حسین کے سامنے پیش کیے اور خطبات کے مباحث اور مصطلحات کے حوالے سے مفید معلومات بھی حاصل کیں۔ مصطلحات کے ضمن میں سید نیازی نے سید سلیمان ندوی سے بھی استفادہ کیا۔ مترجم نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ علامہ کی ہدایات کے مطابق ان کی یہ شعوری کوشش رہی ہے۔ کہ خطبات میں جہاں کہیں بھی جدید افکارِ فلسفہ کی ترجمانی جن الفاظ اور مصطلحات سے کی گئی ہے۔ ان کے اظہار کے لیے جن الفاظ، مصطلحات اور ترکیبات کا انتخاب کیا جائے، وہ انگریزی زبان اور مغربی فلسفے سے ناواقف افراد کے لیے غریب اور نامانوس نہ ہوں۔ نیز اگر کسی مسئلے کی جانب بوجوہ صرف اشارہ کر دیا گیا ہے، تو اس کی تھوڑی بہت وضاحت ضرور کی جائے، تاکہ خطبات کی کوئی بحث مغلق نہ رہے اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی غلط فہمی جنم لے۔ مترجم کے خیال میں چونکہ خطبات کا موضوع بجائے خود نہایت اہم اور اس کے مباحث نہایت دقیق اور پیچیدہ ہیں، نیز علامہ کی ادائے مطلب کی غیر معمولی قدرت کے باوجود، خطبات کی عبارات، جن نئی نئی اصطلاحات، تلمیحات اور اشارات پر مشتمل ہیں، ان تمام کی وضاحت کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب خطبات کا پہلا نسخہ شائع ہوا، تو علامہ کے اشارے سے ایک مختصر سا مضمون روزنامہ انقلاب میں شائع ہو چکا تھا، جس کا مقصد قارئین کو الہیات اسلامی کی تاریخ میں فکرِ اقبال کے مقام سے واقف کرانا تھا۔ مترجم کے خیال میں اسی احتیاط کے پیشِ نظر ترجمے کی رفتار سست رہی ۱۹۳۱ء کے ابتدا تک خطبات کا زائد حصہ ترجمہ ہو چکا تھا، تاہم مترجم کی چند ذاتی مصروفیات اور علامہ کی علالت کے باعث خطبات کے تراجم کی اشاعت میں تاخیر واقع ہوئی، تاہم ستائیس برس بعد بزمِ اقبال نے علامہ کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال کی اجازت سے ۱۹۵۶ء میں اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

مترجم کا خیال ہے کہ ۲۷ برس بعد ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں جو عملی طور پر قدم اٹھایا گیا، اس ضمن میں

جب ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء کے مسودات کو جمع کیا گیا، تو مسودات کا بہت سا حصہ بکھرا ہوا پایا، یہاں تک کہ بہت سی یادداشتیں بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوسکیں۔ نیز علامہ کی ہدایت کے مطابق ایسی ہر عبارت، جس کا ترجمہ بسبِ ایجاز کلام، یا جدید فلسفیانہ اور علمی افکار کی بحث میں کسی قدر مغلق یا عسیر الفہم نظر آئے، تو ایک حد تک اسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ ۱۹۳۰ء تک جب بھی علامہ نے دوسرے خطبے کے بعض اہم اجزا کا ترجمہ ملاحظہ کیا، تو مذکورہ طرز کی عبارات کی وضاحت اور بعض کی ترامیم کی۔ علامہ کی وفات کے بعد مترجم نے ترجمے کے سلسلے میں ایک احتیاط یہ کی کہ وہ تمام توضیحات جس کا اضافہ مترجم نے اپنے قلم سے کیا تھا، وہ بہ شکل تصریحات اور حواشی کی ذیل میں درج ہیں۔ مترجم نے اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ علامہ کی معدودے چند توضیحات، نیز دوسرے خطبے میں اور لفظ مصنف کے اضافے کے ساتھ، حواشی میں ملیں گی، تاکہ ان میں اور دوسرے حواشی میں امتیاز ممکن ہو سکے۔ مترجم نے اس سلسلے میں حواشی کے اندراج کے طریقِ کار پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس کے تحت کہ مذکورہ سب حواشی کی حیثیت حواشی کی بجائے عبارت ہی کے ایک حصے، یعنی ان تمام ناتمام جملوں کی سی ہے، جن کے سامنے ایک چھوٹا سا خط کھینچا گیا ہے تاکہ قارئین اس کو متن کے ساتھ ملا کر پڑھ لیں، اور عبارت کا مفہوم واضح ہو سکے۔ نیز فی الواقعہ حواشی چونکہ بڑی تعداد میں ہیں، اس لیے ان کے آخر میں لفظ مترجم کا اضافہ ملتا ہے۔ مترجم مقدمے کے ضمن میں اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ علامہ کی علالت کے سبب نہ تو ترجمے کی نظرِ ثانی ممکن ہوسکی اور نہ ہی وہ بعینہٖ مقدمے کے لیے ان سے کوئی واضح ہدایات حاصل کر سکا۔ لہٰذا مترجم کی اقبال سے خطبات کے موضوع پر جو وقتاً فوقتاً بحث ومباحثہ ہوا، یا زیرِ بحث مسائل سے متعلق اقبال نے جو ارشادات فرمائے، وہ مترجم کے ذہن میں موجود تھے، یوں مترجم نے اپنی یادداشتوں کی بنا، پر چند ایک معروضات تمہیداً قلمبند کی ہیں، ان تمام باتوں کی تفصیل، کسی دوسری جگہ مکتوباتِ اقبال میں موجود ہے۔

سید نذیر نیازی نے شعور طور پر خطبات کا ترجمہ، اول تا آخر، انگریزی متن کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے انگریزی متن میں مطابقت کا خیال صرف الفاظ وتراکیب میں ہی نہیں بلکہ جملوں کی طوالت اور اختصار میں بھی قائم رکھا ہے۔ سید نذیر نیازی نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے مقدمے میں ترجمے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ایک یا دو مقامات پر انہوں نے اپنی طرف عبارت میں زبان کی رعایت اور ادائے مطالب کے سبب، انگریزی متن کے ترجمے میں ردّ وبدل یا اضافہ کیا ہے۔ خطبات کے دیباچے کے ترجمے میں، تحشیے یا تصریح کی گنجائش نہ ہونے کے باعث ایک دو مقامات پر وہ اگرچہ اصل متن سے مطابقت قائم نہیں رکھ سکے، تاہم مصطلحات کے ضمن میں جہاں انہوں نے گول دائرہ بنایا ہے، اس سے اپنی وضع اصطلاح مراد لی۔ نامانوس اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ایک غیر ملکی زبان سے روایاتِ علم کا سلسلہ پھر

سے جوڑا جا سکے۔ نیز ضرورت کے تحت مترجم نے ''فرہنگِ مصطلحات'' سے تصریحی شذرات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

خطبات کے ضمن میں دوسرا ترجمہ ڈاکٹر سمیع الحق کا ''تفکیرِ دینی پر تجدید نظر'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ ڈاکٹر سمیع الحق کی کتاب ''تفکیرِ دینی پر تجدید نظر'' میں تراجم کے حوالے سے کوئی مقدمہ نہیں ملتا، تاہم ''غرضِ مترجم'' کی ذیل میں مترجم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۹۶۳ء میں جب سید نذیر نیازی کا ترجمہ ان کی نظروں سے گزرا تو انہیں احساس ہوا کہ سید نذیر نیازی نے انگریزی لفظوں کو خود ساختہ عربی میں ترجمہ کر کے بوجھل بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً Spontaneous کا ترجمہ ''ابدائی'' Embrace کے لیے ''احتوا'' Categorical Imperative کے لیے ''قطعی حکم'' Vested Interest کے لیے ''حقوقِ مزعومہ'' جیسے الفاظ اس ضمن میں اہمیت کے حامل ہیں۔ سمیع الحق کے خیال میں سید نذیر نیازی کا ترجمہ پڑھتے ہوئے اس امر کا احساس ہوتا ہے جیسے کسی سازش کے تحت اردو کو غیر مقبول بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

مترجم کے خیال میں اردو کے آسان سے آسان الفاظ کی تلاش ہی ایک مترجم کی اہم ذمہ داری ہے۔ ترجمہ کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے، کہ ایک ترجمہ پڑھنے کے لیے کسی کو ایک ایسی زبان سیکھنا پڑے، جس کے الفاظ عوام کی سمجھ سے باہر ہیں۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر سمیع الحق نے ترجمہ میں عامیانہ الفاظ و تراکیب، مقامی زبان اور بعض مقامات پر غیر ضروری محاورات کا سہارا لیتے ہوئے علامہ کی فکر کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، مثال کے طور پر:

''وہ سمجھنے لگتا ہے اور وہ اس سے کم تر نہیں سمجھتا''

''توفیق فطرت ہے جو تر کی زبان کا شاعر ہے اور ابھی کچھ ہی دن ہوا وہ مر گیا''

''زمان و مکان کی یہ بے پایانی اس توقع کی حامل ہے کہ انسان اسے مکمل طور پر مسخر کر لے سکتا ہے''

''لیکن جب فکر کی تحلیل سے غزالی کی امید بر نہیں آئی تو............''

''اس رفتار میں کوئی گڑ بڑی نہیں ہے''

''پرانے مسائل کا حل تازہ واقفیتوں کی روشنی میں ڈھونڈ لیا گیا ہے''

علاوہ ازیں ان کے ہاں املا اور قواعد کی اغلاط بھی عام ہیں، مثلاً:

''اس کا وجود کسی تخلیقی لہولعب کا نتیجہ نہیں ہے''

''جہاں وہ بے پناہ الطاف و فیوض روحانی کا انکشاف کرتا ہے''

''تم بے شک اوپر جائے جاتے رہو گے''

''اس کو اا پنے آغوش میں لے لیتی ہے''

ترجمے کے حوالے سے تیسری کوشش شہزاد احمد کی ''اسلامی فکر کی نئی تشکیل'' کی صورت میں سامنے آئی۔شہزاد احمد اپنے ترجمے کے ابتدائیے میں ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی منعقدہ پہلی فلاسفیکل کانفرنس کا احوال بیان کرتے ہوئے، اس کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وزڈم (Dr. Wisdom) کا بیان نقل کرتے ہیں، جو انہوں نے افلاطون کے مکالمات (Dialouges of Plato) کے ضمن میں کہا، جس کے مطابق ہر پچاس برس میں زبان کے اندر کچھ ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں، کہ نئے قاری کے لیے نئے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے افلاطون کا ترجمہ ہر پچاس بعد ہو جانا چاہئے۔شہزاد احمد اقبال کے خطبات کے حوالے سے ڈاکٹر وزڈم کے بیان میں اپنے ترجمے کا جواز تلاش کرتے ہیں۔

شہزاد احمد نے یہ ترجمہ سراج منیر مرحوم کی فرمائش پر پانچ ماہ میں ۱۹۸۷ء میں مکمل کیا۔ترجمے کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا کی فرمائش پر جب یہ ترجمہ انہیں دکھایا گیا، تو انہوں نے ایک مقام پر آدھے جملے کا ترجمہ نہ پا کر ترجمے میں مزید اغلاط کے امکان کی جانب اشارہ کیا۔الطاف گوہر نے انہیں نظر ثانی کی ہدایت کیں۔لہٰذا سراج منیر کی تحریک پر سہیل عمر نے نہ صرف ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ اس سلسلے میں شہزاد احمد سے طویل مذاکرات بھی کیے۔اگرچہ اس ترجمے کو احمد جاوید نے بھی دیکھا، تاہم اس کی موجودہ شکل سہیل عمر ہی کی دی ہوئی ہے۔شہزاد احمد کا یہ دعویٰ ہے کہ، ان کا ترجمہ ''خطباتِ اقبال کا رواں اور سلیس ترجمہ'' ہے۔

''ابتدائیے'' میں اپنے ترجمے کے طریقِ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی شعوری کوشش یہی ہے کہ ترجمہ آسان اور سہل ہو، بعض مقامات پر انہوں نے اصطلاح استعمال کرنے کے بجائے، اس طرح سے مطلب بیان کیا ہے، کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں، اور مفہوم بگڑنے نہ پائے۔شہزاد احمد کے ترجمے میں اردو مترادفات کے ساتھ جابجا انگریزی لفظیات کی بھرمار دکھائی دیتی ہے، مثال کے طور پر، واہمہ (Illusion)، ساخت (Structure)، شعار (Couduct)، القا (Inspiration)، اضداد (Oppositions)، مجموعہ (Doctrine)، تشکیک (Scepticism)، مظہر (Phenomenon)، علیت (Causality)، معروض (Object)، روحانی اثبات (Affirmation)، انگیزہ (Impluse)، قضیوں (Propositions)، استدلالی منطق (Discursive)، نتائجی (Pragmatrc)، متناہی معلول (Finite Effect)، غیر متغیر (Immutable)، نامیات (Organism)، متوازی (Parallel)، تمثیل (Anology)، ماہیت قلب (Transmute)، پرہیزگارانہ (Devotional)، صدوری (Emergent)، ممیّز (Distinct) اور فکری بغاوت (Intellectual) کی طرح اور بھی انگریزی

لفظیات کی بھرمار ان کے ترجمے میں موجود ہے۔

خطبات کے ترجمے کے حوالے سے چوتھی کوشش پروفیسر شریف کنجاہی کی کتاب ''مذہبی افکار کی تعمیر نو'' صورت میں سامنے آئی ۔ پروفیسر کنجاہی نے سید نذیر نیازی کا ترجمہ مشکل اور ثقیل پا کر آسان ترجمے کی جانب توجہ مبذول کی ۔انہوں نے اقبال کے خطبات کے Perface کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مقام پر درج ذیل عبارت قلمبند کی:

''لیکن ان کی گدی پر بیٹھنے والے (جدید ذہنی تقاضوں سے آگاہ ہونے کے
باعث)اس قابل نہیں رہے کہ آج کی سوچ اور آج کے تجربے سے کوئی نئی
تحریک حاصل کرسکیں۔''

ترجمے کے عمل میں قوسین کا استعمال توضیح وتشریح کے رجحان کو جنم دیتا ہے، نیز ان کے الفاظ کا چناؤ عامیانہ ہے، جو کم از کم علامہ کی فکر کی ترجمانی کے حوالے سے موثر دکھائی نہیں دیتے۔ ترجمے کو آسان اور فہم بنانے کے خیال میں یہ عام بول چال کی زبان کو اس حد تک استعمال کر گئے کہ ان کے ترجمے میں عوامی اور مجلسی انداز گفتگو کا رنگ غالب آ گیا۔ علامہ نے اپنے Perface میں ایک مقام پر لکھا۔

"Classical Physics has learned to criticize
its own foundations."

پروفیسر شریف کنجاہی کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''کیونکہ کلاسیکی طبیعیات آج ہی اپنی بنیادی باتوں پر اعتراض کرنے لگ گئی ہے''

ان کے ترجمے سے درج ذیل مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں:۔

''یہ انسان کے بھاگوں میں ہے''

''وہ کڑے نصیبوں والا ہے...''

''بظاہر سدا رہنے والی دنیا کا یہ جلوہ گزاراں جس کے ذہن نے سدا رہنے کی طلب میں پیدا کیا ہے....''

''اس بحث سے یہ بات پکی طرح کھل جاتی ہے....''

''اور جب وہ لوٹ آتا ہے تو اس کی لوٹ لوگوں کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوتی''

''لیکن پیغمبر کی واپسی تخلیقی ہوتی ہے وہ اس لیے لوٹتا ہے کہ زمانہ کے بہاؤ
میں پا انداز ہو کر تاریخ کی قوتوں کو زیر عناں کرتے ہوئے ارمانوں کی ایک

نئی دنیا پیدا کرے۔''

مذکورہ مثالوں سے احساس ہوتا ہے جیسے شریف کنجاہی سادہ بیانی کے خیال میں اکثر مقامات پر اصل سے بھی دور نکل گئے ہیں۔

خطبات کے سلسلے میں پانچویں کوشش، ڈاکٹر وحید عشرت کی کتاب ''تجدید فکریات اسلام'' نظر آتی ہے۔ اگر چہ ان کے خطبہ وار ترجمے کو اقبال اکیڈمی کے ممبران نے بہت سراہا اور اسے سہل، مستند اور جدید اسلوب کا حامل قرار دیا ہے۔ مترجم کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اپنے ترجمے کی زبان انتہائی سہل، رواں اور بوجھل اصطلاحات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، صرف ناگریز اصطلاحات کو استعمال کیا ہے، نیز ترجمہ کرتے ہوئے ان کی شعوری کوشش یہ رہی کہ ترجمہ کو طبع زاد کتاب کا روپ عطا کیا جا سکے۔ ڈاکٹر وحید عشرت کے اس خیال کی روشنی میں جب ان کے ترجمہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی قسم کے سقم دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

> ''قرآن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ خدا اور کائنات سے انسان کے مختلف الجہات روابط کا بلند شعور اجاگر کرے''
>
> ''انائے عمیق کے اس حیاتیاتی عمل میں کیفیات شعور ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔''

مجموعی طور پر ایسی بہت سی مثالیں ہیں، جو مقالے میں تراجم کے باب کے ضمن میں درج کر دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر وحید عشرت کے ترجمے کے حوالے سے اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے ترجمے میں بعض مقامات کے حوالے سے خطبہ وار حواشی درج کیے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے مذکورہ ترجمے کے اختتام پر انہوں نے (۱) کی علامت درج کرتے ہوئے خطبہ سوم کی ذیل میں حاشیہ نقل کیا ہے۔(C.F Creative Evolution) وہ سعید شیخ کے مرتبہ متن کے (۴۷۵) کی نقل ہے۔ مجموعی طور پر انہوں نے اپنے تراجم کے اختتام پر خطبہ وار حواشی سعید شیخ کے مرتبہ متن سے نقل کیے ہیں۔

تراجم کے علاوہ خطبات کی توضیحات و تسہیلات کے ضمن میں بھی کاوشیں منظر عام پر آئیں۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش خلیفہ عبدالحکیم کے سامنے آئی۔ ان کی تصنیف ''فکرِ اقبال'' کا شمار اقبال پر لکھی جانے والی چند اعلیٰ پائے کی تصانیف میں ہوتا ہے، لیکن اس میں افکارِ اقبال کو بیشتر ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ اس کے آخر میں خطباتِ اقبال کو، ایک تلخیص کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، جسے ڈاکٹر طارق عزیز کی تدوین کے بعد بزم اقبال نے ''تلخیص خطبات اقبال'' کے نام سے الگ کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں خلیفہ

عبدالحکیم نے خطبات کی تلخیص کی کوشش کی ہے مگر ان کی یہ کوشش ان کی تلخیص کو اکثر مقامات پر ترجمے کا رنگ عطا کرگئی۔ اس ضمن میں مثالیں مذکورہ باب چہارم میں درج کی جاچکی ہیں تاہم تفہیم اقبال کے ضمن میں اس کتاب کو اہمیت کا حامل خیال کیا جاسکتا ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں دوسری کوشش ۱۹۴۸ء میں پروفیسر شریف بقا کی کتاب ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے سامنے آئی۔ اس کتاب میں شریف بقا نے خطبات کے اہم نکات کو اختصار سے پیش کیا، جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے خطبات کے مطالب کی ترجمہ نما تشریح قرار دیا۔ مصنف نے علامہ کی فکر کو خطبہ وار بیان کرنے کی کوشش کی، تاہم انہوں نے تمام خطبات سے اہم نکات کو زیر بحث لانے کی شعوری کوشش کی ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں تیسری کوشش ڈاکٹر سید عبداللہ کی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر تفہیمِ خطبات کے حوالے سے ''متعلقاتِ خطبات اقبال'' مرتب کی۔ جس میں عبدالحفیظ کاردار، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر منور اور مظفر حسین کے علاوہ، سید صاحب کے بعض مقالات بعنوان ''اقبال اور فخر رازی''، ''گلشنِ رازِ جدید''، ''خطبات کے آئینے میں'' شامل ہیں۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ کتاب میں شامل مضامین فکر اقبال اور خصوصاً خطبات کے موضوع کو سمجھنے کے حوالے سے اہم خیال کیا جاسکتے ہیں۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں چوتھی کوشش مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب ''خطبات اقبال'' کی صورت میں سامنے آئی۔ انہوں نے خطباتِ اقبال کو عصرِ حاضر کا جدید علمِ کلام قرار دیا اور اسے غزالی، رازی اور ابنِ تیمیہ کے قدیم علمِ کلام سے اس لحاظ سے مختلف قرار دیا کہ قدیم علم الکلام کا مخاطب انسان ہے اور اس لیے یہ علم الکلام تمام عالم کے لیے ہے اور تبلیغی نوعیت کا حامل ہے۔ مولانا نے دوسری وضاحت یہ کی کہ خطبات میں زیرِ بحث علوم اور افکار پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے جائزے لیے جاچکے ہیں۔ تاہم ان کا جائزہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہوگا۔ مولانا نے خطبات کے مذہبی مباحث جیسے تصورِ ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ الٰہیہ، حیات بعدالموت، حشر ونشر، مسئلہ جبر وقدر کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے اقبال کی فکر انگیزی کو سراہا ہے اور بعض مقامات پر ان کی گرفت بھی کی ہے۔ انہوں نے علامہ کے خطبات میں زیر بحث موضوعات پر چند اعتراضات کیے ہیں، جن کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے ان کے اعتراضات بے بنیاد اور بے معنی ہیں۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں پانچویں کوشش ڈاکٹر خالد مسعود کی سامنے آئی۔ ان کی کتاب ''اقبال کا تصورِ اجتہاد'' میں اقبال کے پانچویں خطبے کی توضیح ملتی ہے۔ اس کتاب میں خالد مسعود نے اجتہاد کے پس منظر اور اس

کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں ان کی توجہ علامہ کے خطبہ اجتہاد کی جانب مرکوز رہی ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں چھٹی کوشش ''علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی جانب سے دکھائی دیتی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات نے مختلف ماہرین اقبالیات سے ساتویں خطبات کی توضیح وتشریح پر مبنی مضامین کو، ''تسہیل خطباتِ اقبال'' کے عنوان سے شائع کیا ہے، جو ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں تمام مقالہ نگاروں نے خطبہ وار تسہیل درج کرنے سے قبل خطبات کے اہم نکات اختصار سے بیان کرتے ہوئے اپنے انداز میں علامہ کے تصورات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں ساتویں کوشش یوسف ثانی نے کی۔ ان کی کتاب ''تجزیہ تشکیل الٰہیات اقبال'' اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مصنف نے منتخب کردہ خطبات میں، اقبال کے پیش کردہ تصورات کے تراجم کے ساتھ ساتھ ان کے مفاہیم کے بیان کے ضمن میں بھی اشارے کیے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی توجہ ماہرین اقبال کی خامیوں کی گرفت کی جانب مرکوز رہی۔ بحیثیت مجموعی ان کی یہ کتاب علامہ کے خطبات کی تسہیل میں کوئی اہم بنیاد فراہم نہیں کرتی۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں اٹھویں کوشش پاکستان اسٹڈی سنٹر کراچی کی سامنے آئی۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی کی جانب سے ''اقبال فکرِ تشکیل جدید'' کے موضوع پر سیمینار کے انعقاد کو خطبات کو تفہیم کی جانب اہم قدم قرار دیا جاسکتا ہے، جس میں ملک کے نامور اصحابِ فکر جیسے ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر سید حسین جعفری، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد، ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر وارث میر، پروفیسر منور ، پروفیسر عثمان اور پروفیسر کرار حسین نے، خطباتِ اقبال کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کو سید حسین محمد جعفری نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں نویں کوشش محمد شریف بقا کی کتاب ''خطبات اقبال ایک جائزہ'' کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر شریف نے خطبہ وار تسہیل بیان کی ہے۔ ان کی یہ کتاب، ان کی مذکورہ کتاب، ''خطبات اقبال پر ایک نظر'' کی حرف بہ حرف نقل ہے، حتیٰ کہ کتاب کے ابتدائیے میں سید عبداللہ کا بیان بھی نقل ہے یوں لگتا ہے جیسے کتاب کے عنوان میں ہی تبدیلی کی گئی ہے، باقی تمام کتاب اول الذکر کا ہو بہو عکس ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں دسویں کوشش محمد سہیل عمر نے کی۔ ان کی کتاب ''خطبات اقبال نئے تناظر میں'' کو توضیح کے ضمن میں اہم خیال کیا جاسکتا ہے۔ سہیل عمر نے علامہ کے خطبات سے چیدہ چیدہ انگریزی متن درج

کرتے ہوئے ان کی تسہیل کی کوشش کی ہے، بحیثیت مجموعی ان کی کتاب علامہ کے خطبات میں بیان کردہ تمام نکات کا احاطہ نہیں کرتی۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں گیارہویں کوشش الطاف احمد اعظمی کی کتاب ''خطبات اقبال ایک مطالعہ'' اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں الطاف نے خطبہ وار توضیح بیان کی ہے۔الطاف اعظمی نے اقبال کے تمام خطبات پر اعتراض کرتے ہوئے ان کی قرآن فہمی کو بھی نشانہ تنقید بنانے کی کوشش کی۔مصنف کا خیال ہے کہ علامہ نے قرآنی آیات کا حوالہ نقل کرتے ہوئے ان کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے مفاہیم کا اندراج کیا ہے جو قرآن کے اصل معنوں سے انحراف رکھتے ہیں،اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علامہ نے قرآن سے معنوی انحراف کی کوشش کی ہے۔اعظمی کے اعتراضات بے بنیاد ہیں اوران کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔

خطبات اقبال کی تسہیل کے ضمن میں تیرہویں کوشش، ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب ''اقبال کا نظریہ خودی'' کی صورت میں سامنے آئی۔اس کتاب میں موضوعات وار اقبال کے تصورات کے ضمن میں تشریح کی کوشش ملتی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے خطبہ وار موضوعات کا تجزی ترتیب میں بیان کردہ تصور کے عین مطابق ہیں۔

خطبات اقبال کی تسہیل کے ضمن میں تیرہویں کوشش ڈاکٹر عبدالغنی کتاب ''اقبال کا نظریہ خودی'' کی صورت میں سامنے آئی۔اس کتاب میں مصنف نے خطبہ وار تسہیل کرتے ہوئے اقبال کے تصورات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ان کی کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خطبات کی تسہیل کی بجائے، ترجمے کے حوالے سے کی گئی کوشش ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں چودہویں کوشش پروفیسر عثمان کی دکھائی دیتی ہے۔ان کی کتاب ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' میں اقبال کے خطبات کا مطالعہ ملتا ہے۔پروفیسر عثمان نے اس کتاب میں خطبہ وار مفہوم کی توضیح درج کی ہے۔پروفیسر عثمان نے کتاب کے ابتدائیے میں داستانوی انداز اختیار کرتے ہوئے خطبات کی اہمیت اور اقبال کے عہد میں ان کے مقام کے تعین کی کوشش کی ہے۔مجموعی طور پر انہوں نے علامہ کے خطبات سے منتخب تصورات کی تشریح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں پندرہویں کوشش ڈاکٹر جاوید اقبال کی دکھائی دیتی ہے۔ان کی کتاب'' خطبات اقبال تسہیل وتفہیم'' میں خطبہ وار علامہ کے افکار کی توضیح کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔کتاب کے آغاز میں جاوید اقبال کا طویل مقدمہ موجود ہے۔جس میں خطبات کے نقطہ آغار سے لے کران کے موضوعات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کے خطبات پر کیے گئے اعتراضات کا اندراج کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا ہے اور

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی فکر اوران کے تصورات پر اعتراضات کا اندراج کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی فکر اوران کے تصورات پر اعتراضات کرنے والے اقبال فہمی سے عاری ہیں۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں سولہویں کوشش ڈاکٹر آصف اعوان کی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کتاب ''اقبال کا پہلا خطبہ'' میں پہلے خطبے کی مفصل توضیح ملتی ہے۔ ڈاکٹر آصف اعوان نے خطبہ کی تسہیل کرتے ہوئے علامہ کے اردو اور فارسی اشعار کا بھی حوالہ درج کیا نیز حآلی کے اشعار کو رقم کرتے ہوئے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ علامہ کی فکر جامع اور وضاحت طلب ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں سترہویں کوشش ڈاکٹر محمد آصف اعوان کی کتاب ''معارف خطبات اقبال'' کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں خطبات کا اجمالی، تحقیقی اور توضیحی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے خطبات سے چیدہ چیدہ مقامات سے انگریزی متن کا اندراج کرتے ہوئے اسی متن کی وضاحت کی کوشش کی اور اقبال کے نمایاں تصورات کا بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر خطبات کی تسہیل کے ضمن میں ان کی کتاب میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں اٹھارویں کوشش وحیدالدین نے کی۔ اس کی کتاب ''فلسفۂ خودی'' میں خطبات کی تلخیص وتوضیح اس طور سے کی گئی ہے کہ اقبال کی شاری اوران کی فکر کے مطالعہ کے ضمن میں مذکورہ کتاب مؤثر خیال کی جاسکتی ہے۔ وحیدالدین نے اپنی کتاب میں علامہ کے خطبات سے منتخب مقامات کا انتخاب کرتے ہوئے خطبات پر بحث کی ہے اور کتاب کے اختتام پر مغربی مفکرین کا ضمیمہ بھی درج کیا ہے۔

توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں انیسویں کوشش ڈاکٹر آصف اعوان کی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ''اقبال کا تیسرا خطبہ'' کی تشریح بیان کی۔ اس کتاب میں مصنف نے علامہ کے تیسرے خطبے کے متن کو درج کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی کوشش کی یہ الگ بات ہے کہ اپنی تمام تر تفصیل کے باوجود کتاب میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر خطبات اقبال کی توضیحات وتسہیلات کے ضمن میں اقبال کے نئے افکار کو سامنے لانے کی بجائے بیشتر مصنفین کی توجہ ان میں کمزوریاں تلاش کرنے اوران کے دفاع پر مرکوز ہی جس کے باعث یہ توضیحات وتسہیلات فکرِ اقبال میں اضافے کی بجائے ذاتی تنقید، جانبداری اور عصبیت کی نظر ہوگئیں، اگرچہ تمام توضیحات میں یہ صورت حال دکھائی نہیں دیتی، تاہم خطبات کے چیدہ چیدہ نکات سے بات کرتے ہوئے مذکورہ رجحان اغلب دکھائی دیتا ہے۔

مقالہ ہذا میں خطبات کے انگریزی متن کے اب تک شائع شدہ تمام ایڈیشنز میری نظر میں رہے، جن میں کیمبرج یونیورسٹی لندن سے ۱۹۳۰ء میں چھپے خطبات کی مجموعی شکل میں شائع ہونے والا نسخہ، قیام لندن کے دوران برٹش میوزیم اور اقبال اکیڈمی برمنگم سے حاصل ہوسکا، اس نسخے پر اقبال کے دستخط موجود ہیں۔اس کا عکس باب دوم میں لگایا گیا ہے۔علاوہ ازیں مقالہ ہذا میں، جان سنز Jhon sons کا (مرتبہ) ۱۹۳۴ء میں آکسفوڈ یونیورسٹی پریس لندن سے شائع شدہ نسخہ، شیخ محمد اشرف سے ۱۹۴۴ء سے ۲۰۰۷ء تک شائع شدہ دس نسخے، نصرت علی ناصری کا مرتبہ ۱۹۷۴ء میں دہلی سے شائع ہونے والا نسخہ، نیاز احمد کا مرتبہ ۱۹۹۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع شدہ نسخہ اور پروفیسر شیخ کا محشی ایڈیشن کے تحقیقی جائزہ کے ساتھ ان میں اختلاف متن کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔اردو تراجم وتوضیحات پر کام کرتے ہوئے، خطبات کے انگریزی متن کا محشی ایڈیشن، مرتبہ پروفیسر سعید شیخ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

سعید احمد شیخ نے اپنے خطبات کے انگریزی متن کو نقل کرنے سے قبل ۱۵ صفحات پر مشتمل Editor's Introduction میں نسخے کی تدوین اور ترتیب کے حوالے سے اہم باتیں درج ہیں، مقالہ نگار نے ذاتی طور پر مذکورہ پندرہ صفات کے ترجمہ کے ساتھ علامہ کے Perface کا ترجمے مقالے میں شامل کرتے ہوئے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ اگر خطبات کے ترجمے کو اس انداز میں کیا جاتا تو انگریزی سے ناآشنا افراد کے لیے خطبات کی تفہیم آسان ہوتی۔

نسیم عباس چودھری

لاہور

قرۃ العین حیدر پر اقبال کے اثرات

علامہ اقبال کی شخصیت ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ جن کی شخصیت، فن اور شاعری کی تفہیم کے لیے اقبالیات کی اصطلاحیں بھی وضع ہو چکیں ہیں اور بلا شبہ ان کے شخص و عکس اور فکر و فن کے تناظر میں بہت سے ادبا نے اقبال کی زندگی ہی میں تحریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے علامہ اقبال پر ایک مضمون ''ایک نیا ستارہ ....اقبال'' سب سے پہلے تحریر کیا اور ''سب سے پہلے سجاد حیدر کی قدر شناس نگاہوں نے اقبال کی عظمت کو بے نقاب کیا'' اور بعد ازاں عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالرزاق، مولانا محمد اسلم جیراج پوری کے مضامین بعد میں تحریر ہوئے۔ ہم عصر شعرا میں سرور جہاں آبادی نے ایک نظم ''پروفیسر اقبال'' تحریر کی۔ نادر کاکوروی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حسرت موہانی، علی سردار جعفری، احسان دانش اور پنڈت آنند نرائن ملا پر اقبال کے اثرات نمایاں ملتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے ایک تصنیف اقبال میں علامہ اقبال پر دو نظمیں تحریر کیں۔ مخدوم محی الدین نے بھی ''اقبال'' کے عنوان سے نظم لکھی۔ شعراء کی مانند اردو ناول نگار اور افسانہ خواں بھی علامہ اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جن میں ایم اسلم نے مشرقی اقدار کو محفوظ کرنے کی غرض سے ناول تحریر کیے۔ زوال الحمرا اور رقصِ ابلیس واضح طور پر آپ اپنی مثال ہیں۔ نسیم حجازی، (محمد شریف ۱۹۱۴ء) نے محمد بن قاسم، خاک و خون، یوسف بن تاشفین، شاہین اور داستان مجاہد شائع کر کے تاریخ اسلام کے کردار واقعات کی روشنی میں شجاعت، جرأت اور صداقت کی خصوصیات والے کردار پیش کیے۔ رشید اختر ندوی نے اپنے ناولوں مسلمان اندلس میں اور صلاح الدین ایوبی میں مسلمانوں کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلامی تاریخ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اثرات کو نمایاں کیا۔

علامہ اقبال سے متاثر ہونے کے سلسلہ میں جب بڑے بڑے ادباء و شعرا اس کارمیدان میں اترے تو ادبی گھرانے سے متعلقہ قرۃ العین حیدر اپنے والد محترم کے زیر اثر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اس کارِ میدان میں اتر آئیں۔ یہ دور نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا اور سیاسی، معاشی ابتری کا شکار تھا۔ علامہ

اقبال نے ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے بیدا کرنے کی کاوش کی اور یہ سلسلہ بیسویں صڈی کے تقریباً نصف قبل تک جاری رہا ہے۔قرۃ العین حیدر نے بیسویں صدی کے نصف بعد میں مسلم قوم کو علامہ اقبال کے افکار ونظریات کی روشنی میں خوابِ غفلت سے جگانے کی زبردست کاوش کی۔

قرۃ العین حیدر نے کم سنی ہی میں علامہ اقبال کے افکار ونظریات سے آگاہی اپنے والدین کے طفیل پائی۔ یلدرم اکثر گھر میں کلام گنگناتے رہتے جس سے قرۃ العین حیدر نہ صرف علامہ اقبال کے کلام سے واقف ہوئیں بلکہ ان کے اندر اسلامی دنیا کی خصوصیات جان کر ایک جذبۂ ایمانی اور جوش وخروش پیدا ہوا۔

اقبال کے بعض اشعار جو ابا جان گنگناتے انہیں سن کر پھریری سی آتی۔

''وہ ترے شہدا پالنے والی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا''،''اور ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا''۱؎

''اسی طرح گھر میں ان کی والدہ نذر سجاد بھی کلام اقبال گنگناتی رہی تھیں۔ اور اماں کبھی کبھی گنگناتیں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہواس میں''۔۲؎

قرۃ العین حیدر نے گھریلو ماحول اور وقت کے تقاضے کے مطابق علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ستاروں سے آگے ایک افسانوی مجموعہ ۱۹۴۷ء میں شائع کیا جس کا نام اقبال کے اس شعر سے ماخذ ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانوی مجموعہ رومانیت پر مبنی ہے جس میں ایک افسانہ کا عنوان ''سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا'' علامہ اقبال کے رومانی دور کی ایک نظم ''محبت'' کے ایک مصرع سے ماخوذ ہے۔جس میں حسن وعشق کا رومانی تصور علامہ اقبال کے فلسفیانہ افکار کی جھلک پیش کرتا ہے اور اقبال کی مانند انہوں نے اپنے فن کا آغاز بھی رومانی اثرات کے زیر اثر کیا ہے۔

''میرے بھی صنم خانے، کار جہاں دراز ہے'' یہ دونوں ناول علامہ اقبال کے اشعار سے خود کردہ عنوانات کے تحت تحریر کیے گئے۔کار جہاں دراز ہے کے بیشتر ابواب بھی علامہ اقبال کے اشعار کے مصرعوں کی دین ہیں۔جن میں ''نہ صفاہاں، نہ سمرقند''،'' تار حریر دورنگ''، ''سلسلہ روز وشب''، ''پھر چراغ لالہ''،'' تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا''؟ شامل ہیں۔اسی طرح ان کی تصنیف گلگشت کے حصہ دوم میں جوان کا سفرنامہ کشمیر کے متعلق ہے۔

اس سفر نامہ میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کی زبان میں کشمیر کی صورت حال بیان کی ہے۔اس تصنیف کے ابواب بھی کارِ جہاں دراز ہے۔کی مانند علامہ اقبال کے اشعار سے اخذ کے گئے ہیں۔جن میں ''کوہ کے دمن میں غم خانہ دہقان پیر''، ''خانقاہِ معلیٰ کے مجاہد'' اور ''رخت با کاشمر کشا'' ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ایک اور سفر نامہ کوہ دماوند کا نام بھی علامہ اقبال کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ان کا ایک افسانہ ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' کا عنوان بھی علامہ اقبال کی نظم ''طارق کی دعا'' سے ماخوذ ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے افکار ونظریات کے اظہار کے لیے اپنی تصانیف میں علامہ اقبال کے افکار ونظریات،اور تلفظون کا سہارا لیا ہے جو مختلف اشعار کے مصرعوں کا حصہ ہیں۔جن میں ''مجھے ہے حکم اذاں''، ''نا امید نہ ہو''، ''نہ تن تیرا نہ من''، ''مجھے شیخ و برہمن''، ''اے طائر لاہوتی''، ''پھر چراغ لالہ''، ''جہانِ نو'' اور ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' وغیرہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر بڑا ادیب بننے کی خواہش میں اقبال کے مصرعے، الفاظ، علامات واصطلاحات بڑی خوبصورتی سے استعمال کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔جن میں ''شاہین''، ''خونِ جگر''، ''قلندر'' وغیرہ ہیں۔انہوں نے اپنی نثر بھی نظم کے روپ میں علامہ اقبال کے افکار کے تصویر میں تحریر کی جو انہوں نے کھوئے ہوؤں کی جستجو کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے،اپنے آپ کو بہترین نثر نگار کے زمرے میں پیش کیا۔

میں ایک بڑی سحر طراز افسانہ نگار ہوں۔جی ہاں، جی ہاں،خوب مس حیدر آپ کی تو نثر میں بھی نظم کی سی حلاوت،روانی اور لچک ہے.....میرے کھوئے ہوئے۔

قرۃ العین حیدر کا طرز تحریر علامہ اقبال کے افکار کا مرہونِ منت ہے مگر لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتی ہیں۔لہذا وہ اقبال کے افکار کی روشنی میں جہانِ نو کی تلاش میں کوشاں نظر آتی ہیں:

> ''تو کہاں سے لاؤں جدت؟ جو کام یا بات بھی شروع کروں وہ مجھ سے پہلے پچپن کروڑ دفعہ ہو چکی ہوگی۔اب تمہارے لیے جہانِ نو پیدا کیا جائے۔بالکل نئے اور انوکھے کردار اس میں آئیں۔'' [۵]

قرۃ العین حیدر نے ''جہان نو پیدا'' کرنے کی غرض سے نئے اور انوکھے کردار کی صورت میں بعض اوقات علامہ اقبال کے مسلسل اشعار کا تذکرہ ہو بہو کیا ہے۔قرۃ العین حیدر اپنی نگارشات میں اقبال کے افکار کو اس قدر زیرِ قلم لائیں ہیں کہ اقبال کے اشعار،مصرعے اور تلفظ ان کا اپنا اسلوب نگارش معلوم ہوتا ہے بلکہ بقول پروفیسر فتح محمد ملک:

> ''اقبال قرۃ العین کے خون میں بولنے لگتا ہے اور عہد در عہد صدیاں پھر

سے زندہ ہوکر ان کے کانوں میں ایسا طلسم پھونکتی ہیں کہ ہر واقعہ سراسر حیرت اور تنبیہ الغافلین نظر آتا ہے اور وہ اپنی تمام تر جلاوطنیوں اور ہجرتوں کے سبب اسلام پر ملوکیت کے غلبے میں دیکھتی ہیں۔۶؎

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار سے متاثر ہوکر اپنی تصانیف میں تقلید یا پیروی نہیں کہ بلکہ ادبی میدان میں بڑا ادیب بننے کی تمنا میں ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص پاکستانی عوام کو اقبال کے افکار ونظریات کی روشنی میں جدوجہد کے لیے جذباتی طور پر ابھارہ ہے اور ان کی بے حسی دیکھ کر مذمت کرتے ہوئے تمسخر بھی اڑایا ہے۔انہیں ملت اسلامیہ کی کسمپرسی، بدحالی پر علامہ اقبال کی مانند رونا آتا ہے اور بعض اوقات وہ اس قدر مایوسیت کا شکار بھی ہو جاتی ہیں اور پھر کبھی کبھی ایک انہونی سی امید بھی ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔اس سلسلہ میں وہ مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے علامہ اقبال کے افکار ونظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں احساس دلاتی ہیں۔ یہ احساس حوصلہ افزائی اور تمسخر کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔جس بنا پر وہ علامہ اقبال کے افکار سے متاثر ہوکر ان کی اشاعت کرنا مقصدِ حیات تصور کرتی ہیں۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی اقبال شناسی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بالخصوص ایسے کام کا بھی ذکر کیا ہے جو علامہ اقبال کی وفات کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچا۔

قرۃ العین حیدر نے ملتِ اسلامیہ کے اندر احساس اُجاگر کرنے کے لیے افکارِ اقبال کے مطالعہ کو بنیادی حیثیت دی ہے تاکہ وہ زندہ بن کر جی سکیں۔یہی احساس علامہ اقبال کے ہاں شدت سے موجود ہے جو انہوں نے ملت اسلامیہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے بیسویں صدی کے نصف اول میں تحریر کیا۔قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں یہی احساسات اقبال کے افکار کی روشنی میں بیسویں صدی کے نصف ثانی میں مسلم قوم کو جگانے کی صورت میں تحریر کیے ہیں اور علامہ اقبال کے افکار ونظریات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہوئے مسلم قوم کو افکار اقبال کا مطالعہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

''اسرار خودی'' پڑھو،''رموز بے خودی'' اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہوتو اقبال کا مطالعہ کرو۔۷؎

علامہ اقبال کے ہاں تاریخیت ایک اہم مقام رکھتی ہے جس بنا پر ان کے نزدیک تاریخ بحیثیت ماضی کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ درسِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔بقول ڈاکٹر محمد اسلم انصاری:

''اقبال ایک عظیم شاعر ہے جس نے تخلیقی عمل تاریخ کے ساتھ وابستہ کیا۔ ان کی شاعری میں تاریخ براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔اقبال مسجد قرطبہ

میں تاریخیت سے کہیں زیادہ تخلیقیت کا سفر کرتے ہیں۔ وہ انسان کو تاریخ
کے فریم ورک میں رکھ کر کائنات سے ماورا لے جانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے
ہیں کہ تخلیقی عمل اتنا حقیقی ہو کہ وہ مستقبل کو بدل ڈالے۔ ۸

مندرجہ بالا حقیقت کو قرۃ العین حیدر نے قبول کیا اور انہوں نے اپنی تصانیف میں تاریخ کا بیان ماضی اور مستقبل کے باہم تعلق اور ملاپ کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ وہ حوالہ تو تاریخ سے لیتی ہیں مگر جزئیات علامہ اقبال کے افکار و نظریات اور اشعار سے ظاہر کرتی ہیں۔ جس کے لیے انہوں نے تاریخ کے کئی ادوار، تاریخ سے وابستہ کرتے ہوئے کئی واقعات، اشخاص اور تاریخی ارتقاء کے کئی مدارج سے بندھی ہوئی وارداتوں اور تہذیبوں کو ایک نئی شکل دینے کی ایک کامیاب کاوش کی ہے۔ اس سلسلہ میں وسط ایشیا کی اسلامی تاریخ، ہندوستانی تہذیب کے سلاطین اور مغلوں کے زمانے کے ہند اسلامی تہذیب، برطانوی انڈیا کے دور سے وابستہ ہند یورپی تہذیب، بالخصوص اسلامی ممالک عرب، ترکی، ایران، ہسپانیہ، مصر، فلسطین کی بھی اپنی اپنی انفرادیت قائم کرنے کا احاطہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے افکارِ اقبال کی روشنی میں احساس دلایا ہے کہ مسلمانوں کو زوال پستی میں ڈوب کر بھی یہ فکر لاحق نہیں ہوئی کہ انہیں کس بنا پر ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے۔

''صد حیف کہ جب جہان نو پیدا ہونے کی گھڑی آئی تو شیوخ حرم اپنے
کنبے لے کر فرنگی مقامروں کی سمیت پرواز کر گئے۔'' ۹

قرۃ العین حیدر نے ملت اسلامی کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے افکارِ اقبال کے فروغ پر اہمیت دیتے ہوئے ایک کامیاب سعی کی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی تصانیف آگ کا دریا اور ''فصل گل آئی یا اجل آئی'' میں برطانیہ میں اقبال ایوننگ اکادمی کا تذکرہ کرتی ہیں اور افکارِ اقبال کی اشاعت کے سلسلہ میں اسے مغرب میں روشناس کرواتی ہیں کہ وہ اقبال کے فلسفہ ہی کو اہل مشرق و مغرب کے لیے مشعل راہ گردانتی ہے اور اہل مغرب کو اقبال کے ''پیام مشرق'' کی روشنی میں مشرق سے انس کرنے کا درس دیتی ہیں۔ مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ ٹیگور ہی نہیں ہے حضرت علیؓ اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجئے لیکن بھلا اب عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا۔'' ۱۰

قرۃ العین حیدر نے اقبال اکیڈیمیوں کا تذکرہ کر کے اقبالیات کے فروغ کے سلسلہ میں ایک اہم کڑی بیان کی ہے کہ علامہ اقبال کی پذیرائی صرف برصغیر ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اقبالیات کی اشاعت میں ان کی ذاتی کاوش ان کی اقبال شناسی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ جس سے وہ نظریاتی طور پر علامہ اقبال کی معتقد نظر آتی ہیں۔ اور انہوں نے ملتِ اسلامی کو اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں خوابیدہ

عالم سے بیدا کیا جس پر ملت اسلامیہ عمل پیرا ہونا بھول گئے تھے۔قرۃ العین حیدر نے اسے دوبارہ اجاگر کیا جس کا اعتراف پروفیسر فتح محمد ملک بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بے شک ہمارا حافظہ کمزور ہو چلا ہے۔اقبال کے بعد تو ہمارا حافظہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو چلا تھا کہ بعد ایک مدت کے قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئیں۔'' ۱۱

قرۃ العین حیدر نے تاریخ اسلام پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں عالم اسلام کی کسمپرسی کا نقشہ اقبال کے اندازِ فکر میں کھینچا ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے عرب،ایران،ترکی،ہسپانیہ،مصر،فلسطین کی حالت زار بیان کی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا بیان کیا ہے۔جس کی واضح مثال ''تحریک خلافت''،''ہسپانیہ''،''فلسطین''،''ایران'' کے عنوانات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔وہ مسلمانوں کی کسمپرسی کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں جو دنیائے اسلام میں تباہی و بربادی اور جمود زوال کا مرتکب ہو کر رہ گئے ہیں۔

''مسلمان محض دعاؤں اور عظمت رفتہ کے حوالوں کے سہارے جی رہا ہے۔نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی کربلائے معلیٰ،نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسب معمول گریہ زاری کا شور بلند ہو رہا ہے۔''۱۲

قرۃ العین حیدر مزید ایک اور جگہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔صاحب لوگ،مشنری لوگ،فوجی،سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سوئیز سے گزرتے مراکش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں۔مشرق میں ہر سمت سوا جہالت،سوا پسماندگی،غلامی،ناداری،تباہی اور کیا نظر آتا ہے۔۱۳

اقبال ملت اسلامیہ کی تباہی و بربادی کے پیچھے یورپ کے پنجۂ استبداد کو بھانپ گئے تھے اور ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔مگر قرۃ العین حیدر اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ ملت اسلامیہ خود اپنے ہاتھوں تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے۔چنانچہ اس نے اپنی تحریروں میں اقبال کے مصرعوں کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو خوفناک اور بھیانک حقیقت سے آشکارہ ہے۔جس کے متعلق پروفیسر فتح محمد ملک نے واضح الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

مجھے اقبال کے عہد پہ بہت رشک آیا۔ہر چند دنیائے اسلام یورپ کی استعماری طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں تڑپ رہی تھی مگر اقبال اپنے گردوپیش کی دنیا میں وہ ٹھوس بنیادیں دیکھ سکتے تھے۔جن پر طلوع اسلام کے خواب بنے جا سکتے تھے اور ملی زوال کے مرثیہ کو حریت کا رجز بنایا جا سکتا تھا۔اقبال اپنے سائنسی وژن کے ساتھ تہذیب مغرب کو خود

اپنے خنجر کے ساتھ خودکشی میں مصروف اور نتیجتاً اسلامی دنیا کو آزاد ہوتا دیکھ رہے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ بڑی دل سوزی کے ساتھ ملوکیت اور ملائیت کے پرانے فتنوں سے باخبر کرتے جا رہے تھے۔ اقبال کی انا رجائیت بلا جواز نہ تھی مگر ان کے اندیشے بھی برحق تھے ہمارے عہد کا فنکار کتنا بدنصیب ہے کہ اس کی آزاد دنیا میں اقبال کے اندیشے تو زندگی کی ہولناک حقیقتیں بن چکی ہیں مگر تجدید وانقلاب کے خواب ریزہ ریزہ ہیں آج دنیائے اسلام خود اپنے خنجر سے خودکشی کے عمل پیہم میں یقین محکم کے ساتھ مبتلا ہے۔ اپنے مٹی میں ملے ہوئے خواب کی کرچیاں چننا آج کے دل فگار فنکار کا مقدر ہے۔ چنانچہ وہ طلوع اسلام نہیں لکھ سکتا تو امت مرحوم کا مرثیہ ہی کہہ سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا جگر دیکھیے کہ انہوں نے رجزیہ اور مرثیہ کو شیر وشکر کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری کے ٹکڑے ان کے ہاں محض صناعی کا عمل ہرگز نہیں۔ اقبال کے مصرعے ہمارے سنہرے خواب ہیں اور ان پر قرۃ العین حیدر کی گرہیں ہماری زندگی کی بھیانک حقیقتیں ہیں۔ اپنی تباہی کے ملبے پر بیٹھی ہوئی یتیم وبیسر دنیائے اسلام کو قرۃ العین حیدر اپنے اجتماعی خواب یوں یاد دلاتی ہیں۔۱۴

ملت اسلامیہ کی صدیوں پر پھیلی ہوئی داستان جو علامہ اقبال نے تحریر کی تھی وہ ان کے بعد فقط قرۃ العین حیدر کے حصہ میں آئی جو انہوں نے اپنے تحریروں میں جا بجا پھیلائی ہے۔ جن کے متعلق پروفیسر فتح محمد ملک ان الفاظ کے ساتھ رقم طراز ہیں:

> ''آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی یہ رزمیہ قرۃ العین حیدر نے جس آفاقی تناظر اور جس باشعور جنون کے ساتھ بیان کی ہے وہ اقبال کے بعد آج تک کسی دوسرے فنکار کو نصیب نہ ہو سکا ہے''۔۱۵

قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور علامہ اقبال کے تاریخی شعور سے مطابقت تو نہیں رکھتا مگر ماضی کے ساتھ ایک لگاؤ رکھتے ہوئے ''کھوئے ہوؤں کی جستجو میں'' وہ آتشِ رفتہ کے سراغ اور مسلمانوں کی عظمت کو نشاۃ ثانیہ کے روپ میں تاریخ کا مرکب عمل سمجھتے ہوئے اسلام کے اوائل دور مختلف خطوں اور ہندوستان کے مسلمانانِ فاتحین اور عالم اسلام کے رہنماؤں اور برطانوی سنگینوں کے ظلم وستم کا جائزہ لینا چاہتی ہیں۔ یہ احساسات وہ اپنے اندر تاریخ کے آئینے میں علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں دیکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں پروفیسر فتح محمد ملک علامہ اقبال اور قرۃ العین حیدر کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاشِ ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازم خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین حیدر کے کارنامہ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آئی ہیں۔

اقبال ہی کی مانند قرۃ العین بھی آتش رفتہ کے سراغ میں ہیں ۔اور ان کی تمام سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے ۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین حیدر نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ہے ۔ دونوں کا سوز و ساز ، آرزومندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر غور وفکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں پر موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری وتہذیبی مراقبہ بن گیا ۔ پھر ہر دو مفکر فنکار ہم نصیب بھی ہیں ۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے فکری اجنبیت اور روحانیت جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین حیدر کا مقدر ہے ۔[۱۶]

ہندوستانی نقاد شمیم حنفی نے پروفیسر محمد ملک پر بے جا تنقید کرتے ہوئے نہ صرف پروفیسر موصوف کے ساتھ زیادتی کی ہے بلکہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ بھی سراسر ناانصافی کی ہے۔ فتح محمد ملک نے مندرجہ بالا بیان درست فرمایا ہے کہ اقبال جس نے ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اس کے بعد قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں افکارِ اقبال کا تذکرہ کر کے ہمارے ذہنوں میں اقبال کا ساز و سامان لے کر نمودار ہوئیں ہیں مگر شمیم حنفی نے قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کو بھی پسِ پشت ڈال دیا ہے ۔ درحقیقت فتح محمد ملک کا مقصد فقط یہی تھا کہ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار ونظریات کو دوبارہ ہمارے دل و دماغ میں بعد مدت روشن کیا ہے۔ شمیم حنفی کی یہ رائے صرف درحقیقت تعصب اور ناسمجھی کی بھینٹ چڑھی ہے جس میں انھوں نے فتح محمد ملک کی تنقیدی رائے کو مضحک قرار دیا ہے۔ شمیم حنفی نے پروفیسر فتح محمد ملک پر تنقید کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کی فکری ہم آہنگی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

’’فتح محمد ملک کا تنقیدی رویہ مضحک اس نقطے پر بنتا ہے جہاں قرۃ العین حیدر کا موازنہ اقبال سے کرتے ہیں اور اس حقیقت کو تمام وکمال بھلا بیٹھتے ہیں کہ اپنی تخلیقیت کے فکری آہنگ کے باوجود قرۃ العین حیدر کی بصیرت اور حسیت اقبال کی فکری وابستگی اور ان کی فکر سے مربوط مقاصد کا عکس محض نہیں ہے کہ دونوں کی تخلیقیت کا سفر ہی احساس اور وجدان کے مختلف

علاقوں سے شروع ہوا۔ دونوں کی تخلیقیت کے ارتقائی مدارج بھی ایک دوسرے مختلف ہیں ۔ایسا نہ ہوتا تو اقبال اپنی عظمت کے باوجود اپنے بعد کے ادوار کی معنویت کے پس منظر میں اتنی جلدی متروک نہ سمجھ لیے جاتے اور جیلانی کامران کو نئے لکھنے والوں سے یہ شکایت نہ ہوتی کہ ان کے منظر نامے تو اقبال یکسر غائب ہیں۔'' یہ شمیم حنفی کی مبہم تنقید اور بے بصیری کی دلیل ہے اور اقدار سے محرومی بھی۔''ےا

قرۃ العین حیدر کا تاریخی دور معاشی بدنظمی اور سیاسی انتشار کا دور ہے وہ ایک حساس طبیعت کی مالک اور مخصوص سوچ کی حامل ہیں وہ مشرقی ہیں ہر طرف بے انتہا بدحالی دیکھتی ہیں، مشرق خواہ مسلمانوں یا ہندوؤں کی بدحالی کا ہو، مشرق سے انسیت رکھنے کی بنا پر اس کے لیے گہری تشویش اور دکھ کی بات ظاہر ہوتی ہے۔اس بحران کے سبب ان کے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی ہے جس کے ازالہ کے لیے انہوں نے عالم اسلام اور بالخصوص بیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی تہذیب ومعاشرت ،عروج وزوال ،مشرق کی تحریکات آزادی اور بیسویں صدی کے نصف ثانی میں دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند کے سلسلہ میں انتشارِ انسانیت کا جو دور شروع ہوا اس کی بہترین عکاسی علامہ اقبال کے افکار کے ساتھ مشرقی ادبیات میں اپنی نثر کے روپ میں پیش کیا۔بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

''لیکن میرے نزدیک وہ افسانہ خوان مشرق کی بجائے ادبیہ مشرق کے خطاب کی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے مشرق کی کسمپرسی ،قنوطیت ،شکست آرزو کے بعد ایک آرزو و جو تمنا کی شکل میں اپنے ساتھ وابستہ رکھی ہوئی ہے وہ آرزو انہیں جینے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کرتی ہے جو انہوں نے علامہ اقبال سے سیکھی۔''نہ ہو نو امید'' اقبال کا یہ مصرع ان کی تصانیف میں واضح طور پر جا بجا ملتا ہے۔مغرب کی نسبت مشرق میں ابھی تک یہی ایک شعاع امید قائم ہے جو اقبال نے شاعری کے ذریعے اہل مشرق کو پیام مشرق کی صورت میں عطا کی ۔اسی پیام کی بجھتی ہوئی چنگاری کو سلگاتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں کے وسیلہ سے مشرق کی جانب سے مغرب کو دیا ہے۔جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی تجزیہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر کا مقابلہ مغربی ادیبوں کے ساتھ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے برخلاف مشرق میں ابھی تک ''شعاع امید'' باقی ہے یہ آج کی دنیا کے لیے فکشن کے دائرے میں ایک پیام مشرق ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں دیئے گئے اس پیام کے بعد جو اقبال نے شاعری کے ذریعے نئی دنیا کو دیا تھا۔ یہ دوسرا پیام ہے جو بیسویں صدی کے نصف ثانی میں قرۃ العین حیدر نے افسانہ وناولوں کے ذریعے مشرق کی طرف سے مغرب کو دیا ہے۔ اقبال بھی مغرب کے اداشناس تھے اور قرۃ العین حیدر بھی ہیں۔ لہذا دونوں پیام مشرق میں بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اگرچہ یہ فرق اپنی جگہ پر مشرق کے ساتھ قرۃ العین حیدر کی وابستگی جذباتی ہے۔ جب کہ اقبال کا عرفان مشرق ایک فکری بنیاد پر تھا۔۱۹

قرۃ العین حیدر وقت کو بطور ہیرو پیش کرتی ہے جو ماضی کے تاریکی سے نکلتا ہوا مستقبل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ وقت کی گردش جو جبریت کی علامت ہے یہ تصور انہوں نے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو فنا اور زوال کے تمام تر مظاہر پر محیط وقت کا لامتناہی سلسلہ جاری وساری ہے۔

''سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات، دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ تجھ کو پرکھتا ہے یہ ....سلسلہ روز وشب، صیر فی کائنات، دن اور رات کا حساب.....سلسلہ روز وشب تار حریر دورنگ۔۲۰

شمیم حنفی نے قرۃ العین حیدر کے ادبی وفکری سفر کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے ساتھ موازنہ کیا ہے:

''اقبال کے شعور کا مرکزی اور ان کا Controlling Vision ان کا عقیدہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کا Vision ایسے کسی دائرے کا پابند نہیں ....قرۃ العین حیدر کو ایک فکشن نگار کی حیثیت سے بہر حال وقت اور مکان کے ایک معین حوالے سے کام لینا ہے''۲۱

''شمیم حنفی مزید قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کے تصور زمان کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔ ''یہ پیر جہاں دیدہ'' قرۃ العین حیدر کے یہاں ایک

ناقابل تسخیر مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی پائیداری اور طاقت میں یہ یقین قرۃ العین حیدر کے تصور کو اقبال کے تصورِ زماں سے الگ ادراک کے ایک انفرادی منطقے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔''۲۲

اگر چہ قرۃ العین حیدر کا تصور زماں اقبال کے تصور زماں کے مرہونِ منت نظر آتا ہے۔جس کا مطالعہ شمیم حنفی نہیں کر سکے اور انہوں نے ''سیتا ہرن'' میں قرۃ العین حیدر کے تصور زماں کو سمجھنے کی غلطی کی اور کاوش نہیں کی جو انہوں نے علامہ اقبال سے مستعار لیا ہے۔قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کے تصور زماں کا موازنہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کو فتح محمد ملک کی مانند ناؔمی انصاری بھی تسلیم کرتے ہیں۔

''مصنفہ کے ذہن میں وقت کا تصور بہت واضح اور روشن ہے۔انہوں نے زندگی کے بہاؤ کو وقت کے لامتناہی سلسلے کے پس منظر میں دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے کی جو کوشش کی ہے۔اس کا سراغ سب سے پہلے یا شاعرانہ سطح پر اقبال کے یہاں ملتا ہے یا پھر خود مصنفہ کے ایک دوسرے ناول ''آگ کا دریا'' میں ملتا ہے۔''۲۳

اسی طرح قرۃ العین حیدر وقت کی جبریت کو فنا کی علامت تصور کرتے ہوئے اقبال کے افکار میں تباہی سمجھتی ہیں۔

انگ کور کا مندر......قرطبہ کی مسجد......اول وآخر فنا۔اول وآخر فنا......ظاہر و باطن فنا۔''۲۴

قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت جو ہر شے کو مٹا دیتا ہے، منہدم کر دیتا ہے مگر تخلیقی فن کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔ جس کے اظہار کے لیے انہوں نے اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' پر روشنی ڈالی ہے اور ''مسجد قرطبہ'' کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہوئے فنون لطیفہ پر روشنی ڈالی ہے جسے ہو بہو علامہ اقبال کے افکار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔وہ اقبال کی مانند فن کی تخلیق کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں کہ وقت فن کی اہمیت کو ختم نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس میں ''خونِ جگر'' شامل ہو۔

قرۃ العین حیدر موت (فنا) کے تصور سے اقبال کی مانند خوفزدہ نہیں اور نہ ہی موت کو فنا یا تباہی کی علامت تصور کرتی ہیں۔بلکہ موت کو زندگی کا ایک حصہ قرار دیتی ہیں۔

''میں دشتِ لوط کے کنارے کھڑا ہوں، کس طرف جاؤں موت کہیں بھی کسی راستے سے آسکتی ہے۔''۲۵

''وہ اقبال کی مانند ٹیپو سلطان کی بہادری کی موت کو پسند کرتی ہیں کہ موت کی تباہی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ لہذا ٹیپو سلطان آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ اس بنا پر اقبال نے بھی ٹیپو سلطان کا کردار پسند کیا اور قرۃ العین حیدر نے اسے شہادت کے بعد بھی انگریزوں کے خوف کا سبب قرار دیا۔ ٹیپو سلطان رات کو سوتے میں بھی ہم سے لڑتا تھا۔'' ۲۶

قرۃ العین حیدر کا نظریہ تقدیر بھی علامہ اقبال کے فلسفہ اسلامی کے تابع ہے اور وہ جدوجہد کی قائل ہے۔ جس بنا پر انسان اپنی کاوشوں کو بروئے کار لا کر تقدیر بدلتا ہے۔ وہ اچھی یا بری قسمت پر یقین نہیں رکھتی۔

''لک کوئی چیز نہیں، یہ اصطلاح بھی سرمایہ داروں کی جعل سازی ہے لائف میں بیڈ لک ہے یا گڈ لک تیسرا کچھ نہیں ہے۔'' ۲۷

''نظریہ وطنیت بھی قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال کے ملت اسلامیہ کے نظریہ کے مطابق ہے۔ وہ اقبال کے شاہین کی مثال دیتے ہوئے ملت اسلامیہ کو مغربی نظریہ وطنیت سے برتر قرار دیتی ہیں۔ مسلمان کا کوئی وطن نہیں.........ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ۔'' ۲۸

لیکن وہ اقبال کی مانند مسلمانوں کے علیحدہ مملکت کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ یہ ریاست آزاد ہو یا حکومت برطانیہ کے تابع ہو، مگر اس میں مہاجرین کے ردوبدل کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ قرۃ العین حیدر بھی تقسیم کے عمل کو مہاجرین کے ردوبدل کے سبب ناپسند کرتی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی تصنیف ''آگ کا دریا'' میں علامہ اقبال کے ''نظریہ قومیت و وطنیت'' کی رو سے کمال نامی کردار کی زبانی قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں ٹھہر جاتا ہے مگر اسے وہاں مسلمان ہونے کی بنا پر ملازمت نہیں دی جاتی۔ جس کا اظہار وہ اپنی ایک دوست سے کرتا ہے کہ ہندوستان مت آنا۔ آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو میرا یہاں ہو رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال انقلابِ روس سے اس قدر متاثر نہیں تھے اور نہ ہی اسلام کی نسبت اسے پسند کرتے تھے جتنا ترقی پسند مصنفین یا اشتراکی لوگوں نے ظاہر کی۔ اسی وجہ سے وہ علامہ اقبال کے ان نظریات کو اپنی تحریروں میں جا بجا پیش کرتی ہیں اور اقبال کے نظریات کی روشنی میں اشتراکی لوگوں کا تمسخر اڑا کر شرمندہ کرتی ہیں۔ جس انقلاب کو اشتراکی پسند کرتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کی ملامت اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کرتی ہیں۔ جس

نے مسلمانوں کے لیے عذاب برپا کیا تھا۔

''بغداد والے انور پاشا روس پہنچے۔ بالشویک فوج سے لڑے شہید ہوئے
انقلاب روس والاماں دیدہ ام.....شور در جاں مسلماں۔''۲۹

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار و نظریات میں نظریہ تعلیم، مرد مومن، غازی، اشتراکیت وغیرہ میں براہِ راست اثرات قبول نہیں کیے بلکہ ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں حکومت پاکستان کے اعلیٰ افسران کا بھی تمسخر اڑاتی ہیں جو ملت اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ان کے مستقبل سے وابستہ ہیں اور اسی طرح قرۃ العین حیدر کا طنز و مزاح کا عنصر اور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ''طنز و مزاح'' کے موضوع میں بھی قرۃ العین حیدر نئی نسل کا مذاق اڑاتی ہیں جو اقبال کی طرح ''شاہین'' کی خصوصیات جانچنے کی بجائے ''چوہے'' پر ریسرچ کر کے قیمتی سرمایہ اور وقت ضائع کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو حکومت پاکستان سے شکوہ و شکایت بھی ہے کہ اقبال جس نے ملتِ اسلامیہ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کے مقبرے کے لیے عوام نے چندے کی اپیل کی تو حکومت افغانستان نے اعانت کا اعلان کیا جس پر انہیں گہرا صدمہ ہوا اور وہ مایوسی کے عالم میں ان کا تمسخر یوں اڑاتی ہیں:

''اقبال..... ہائے اقبال۔ یہ ایک بہت بڑا شاعر تھا جس نے قوم کی بدنصیبی
کی وجہ سے اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور بد
نصیب قوم نے اخباروں کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ اس کا مزار بے حد
گرینڈ بنوائے گی لہذا چندہ جمع ہونا شروع ہوا اور فرزند کوہستان، شاہ
افغانستان کی طرف سے بھی شاہی عطیے کا فرمان جاری ہوا۔''۳۰

قرۃ العین حیدر احساس تفاخر میں بھی مبتلا نظر آتی ہیں دراصل احساس تفاخر ہی احساس کمتری کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے۔ ''کار جہاں دراز ہے'' (جلد اول) میں انہوں نے اپنے خاندان کو اقبال کے خاندان سے اعلیٰ قرار دینے کی کاوش کی ہے اور ظریفانہ انداز میں علامہ اقبال کا ''حکیم الامت اور جھوائی ٹولے کا نسخہ'' کے باب میں واضح انداز میں تمسخر اڑایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کے اندر سے احساس کمتری کا عنصر زائل نہیں ہوا۔ انہوں نے اقبال کے مقابلے میں اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کو پروفیسر تھامس آرنلڈ کا بہترین شاگرد اور تھامس آرنلڈ کو یلدرم کا بہترین استاد کے روپ میں پیش کر کے احساس کمتری کو چھپانے کی زبردست کاوش کی ہے۔

''بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے بہترین طلبا میں تھا اور اپنی

قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے...... پروفیسر صاحب موصوف
عربی عبا پہن کر کالج کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔۱۸۹۸ء میں
سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔۳۱

اسی طرح انہوں نے اپنی مذکورہ تصنیف میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کو درزی ثابت کر کے اپنی والدہ نذر الزہرہ کو ان کے سیے ہوئے کپڑے پہنا کر اپنے اعلیٰ خاندان کا ثبوت پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے یہاں احساس تفاخر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

''میر مظہر علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی لاڈی تین سالہ پوتی نذر الزہرا کو شیخ
نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی برقعہ اڑھا کر گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھلاتے
اور صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہوا ہو جاتے۔۳۲

قرۃ العین حیدر نے اقبالیات کے سلسلہ میں ایک اہم کام سرانجام دیتے ہوئے اقبال شناسی کی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور اقبال کے ساتھ اپنے خاندانی مراسم کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے تعلقات کی روشنی میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ قادیانیت کے حوالے سے بھی انہوں نے علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد اور اپنے خالو میر افضل کے تعلقات کو ظاہر کر کے اقبال کے ساتھ اپنے خاندانی تعلقات ظاہر کیے ہیں اور خواجہ کمال کے بیٹے کا احوال قادیانیت کی رو سے بیان کیا ہے۔

علامہ اقبال کے دور حیات میں جو کام مکمل نہ ہو سکا، اسے قرۃ العین حیدر نے سجاد یلدرم کے ذریعے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے یا اسے آگے بڑھایا ہے۔ اس سلسلہ میں سجاد حیدر یلدرم کا خط جس میں سر سکندر حیات کا مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد واضح ثبوت ہے۔ اسی طرح ایران کے متعلق بھی انہوں نے ''کوہِ دماوند'' میں رضا شاہ پہلوی کے زوال کی داستان کو قلمبند کر کے علامہ اقبال کی پیش گوئی ''نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی'' کی سچ ثابت کیا ہے۔

''قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں افسانوں اور ناولوں کے موضوعات
میں جا بجا علامہ اقبال کے تخیلات، افکار ونظریات، الفاظ، مخصوص علاماتِ
واصطلاحات، تشبیہات واستعارات اور اشعار کے حوالے سے خوبصورتی
پیدا کی ہے اور اپنے قارئین کو علامہ اقبال کے افکار ونظریات سے آگاہ
کرتے ہوئے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اقبال
کے اسلوب نگارش کے سحر میں اس قدر ملوث ہیں کہ وہ خود کو اس سے باہر

نہیں نکال سکتی اور اپنی تصانیف میں وہ اقبال کی امیجری پیدا کرنے کی زبردست خواہاں ہیں اور متحیر بھی رہیں کہ اسے کس طرح اپنی تحریروں میں پیدا کروں، چنانچہ وہ اس معاملہ میں بڑی حدتک کامیاب بھی ہوئیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ان پر علامہ اقبال کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں اور اسی وجہ سے حکومت ہند نے انہیں ''اقبال سمان'' کا ایوارڈ بھی ۱۹۸۷ء میں عطا کیا ہے۔۳۳

حواشی

۱۔ کار جہاں دراز ہے، جلد دوم، ص ۳۴۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔

۳۔ بال جبریل، ص۔ ۶۱

۴۔ ستاروں سے آگے، ص۔ ۱۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۶۷۔

۶۔ تحسین وتردید، ص۔ ۵۴۔ ۵۳۔

۷۔ ستاروں سے آگے، ص۔ ۹۷

۸۔ روزنامہ نوائے وقت، ص۔ ۲

۹۔ جہاں دیگر، ص ۱۵۔

۱۰۔ شیشے کے گھر، ص۔ ۲۷۲

۱۱۔ تحسین وتردید، ص۔ ۵۸

۱۲۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اول، ص۔ ۱۳۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔

۱۴۔ اپنی آگ کی تلاش میں، ص۔ ۱۹

۱۵۔ تحسین وتردید، ص۔ ۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۱۷۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ص ۳۷۴

۱۸۔ قرۃ العین حیدر کا فن، ص۔ ۱۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۰۔ چار ناولٹ (سیتا ہرن)، ص ۱۸۶

۲۱۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ص۔ ۳۷۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۶۳۔

۲۴۔ ستمبر کا چاند، ص۔ ۱۸۴

۲۵۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اول، ص۔ ۳۳

۲۶۔ چاندنی بیگم، ص۔ ۳۸۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۸۔ آگ کا دریا ص۔ ۴۹۸۔ ۵۰۴

۲۹۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اول، ص ۲۱۹

۳۰۔ شیشے کے گھر، ص۔ ۹۷

۳۱۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اول ص۔ ۱۲۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۵۵۔

۳۳۔ ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، ص۔ ۱۶۵

ڈاکٹر محمد نفیس حسن

فکرِ اقبال کی اسلامی اساس

اقبال کی فکر کا جہاں نہایت بلند اور وسیع تر ہے، مذاہب و ادیان کی تاریخ فکر و فلسفہ اور مختلف علوم و فنون کے وسیع تر مطالعے، گہرے مشاہدے اور تجربے نے اقبال کے فکر و شعور اور قلب و وجدان پر اسلام کی برتری اور وحدت کا نقش قائم کیا۔ حیات و کائنات کے گوناگوں تصورات اور مختلف حالات و مسائل کو انھوں نے دین اسلام اور اس کے اساسی دستور قرآن مجید کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اقبال کے جہانِ فکر میں مذہب کا تصور آفاقی، حرکی اور محسوسات و مدرکات پر مبنی ہے، محدود، جامد اور ساکت نہیں۔ ان کے نزدیک مذہب کی اصل روح وہی ہے جو خالق کائنات سے انسان کا حقیقی رشتہ قائم کرتی ہے اور انسان کے پورے نظام زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک مذہبی روح مسلک زندگی کی تقویم ہے یعنی انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے ایک واضح پیغام، آفاقی، ابدی، ہمہ گیر، ہمہ جہت، منضبط الہامی خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں اقبال فرماتے ہیں:

> ''مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہو جاتی ہے جن میں ہر دور کو ایمان، فکر اور معرفت کے ادوار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ایمان کا ہے دوسرا فکر اور تیسرا عرفانِ حقیقت کا۔ دورِ اول کی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس میں مذہب کا ظہور ایک ایسے نظم و ضبط کی شکل میں ہوتا ہے جسے افراد ہوں یا اقوام ایک قلم کے طور پر اور اسے بے چوں و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ نظم و ضبط کی پوری پوری اطاعت کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب لوگ عقلاً اس پر غور کرتے ہیں اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس کا حقیقی سر چشمہ کیا ہے۔ اس دور میں مذہب کو کسی مابعد الطبعیات کی جستجو رہتی ہے۔ جو اس کے لیے اساس کا کام دے سکتے۔ تیسرا دور آتا ہے تو مابعد الطبیعات کی جگہ نفسیات کے لیے خالی ہو جاتی ہے اور انسان کو یہ آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہِ راست اتحاد و اتصالی

قائم کرے یہی مرحلہ ہے جس میں مذہب کا معاملہ زندگی اور طاقت کا معاملہ بن جاتا ہے اور انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک آزاد اور بااختیار شخصیت حاصل کرے شریعت کے حدود و قیود کو توڑ کر نہیں بلکہ خود اپنے اعماقِ شعور میں اس کے مشاہدے سے۔''

(تشکیل جدید....ص۔۲۹۵۔۲۹۳)

اقبال کی فکر بلند کے مختلف ستون ہیں۔ان میں سب سے قوی اور بلند دین اسلام اور اس کی تعلیمات واحکام ہیں جو خالصتاً وحی الٰہی عقیدۂ توحید و رسالت، انسانی عظمت وفضیلت احترام انسانیت، عالمی مساوات، اخوت ومحبت ،ایثار وعزیمت اور بقائے حیات پر مرکوز ہے۔اقبال نے اسے اپنے مخصوص موضوع تصور خودی کے وسیع تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے تصور خودی کا سرّ نہاں اسلام ہی ہے۔ابتدائے کلام سے تا آ کر ان کی فکر کا محور اسلام رہا ہے۔جوان کے جذبۂ یقین اور ایمان سے عبارت ہے۔اسلام پر اقبال کا ایمان ویقین موروثی اور جامد قسم کا نہیں بلکہ وہ ان کے عقل وادراک فکر وشعور اور وجدان اور ان کے قلب وضمیر کا آئینہ ہے۔یہ فیضان نظر ان کے والد بزرگوار کی اس نصیحت کا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی اللہ تم سے ہم کلام ہے۔اقبال کی شخصیت فکر، فلسفہ، کلام اور پیام سب اسی کلامِ الٰہی تنزیل ربانی قرآن مجید سے عبارت ہے۔ان کے نزدیک قرآن اور مسلمان لازم وملزوم ہیں۔قرآن کے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور ممکن نہیں صاف فرماتے ہیں ۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآن زیستن

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

اقبال کا تصور خودی بھی بالخصوص قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔اس لیے کہ قرآن کی رو سے انسان کی تخلیق کوئی کھیل تماشا نہیں۔اسے ایک واضح ومتعین مقصد بندگی رب اور تسخیر انفس وآفاق کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔اس کائنات کی اصل رونق منتہائے تخلیق الٰہی انسان ہے۔اس کائنات میں اسے اپنے عارضی وفانی قیام میں اپنے روحانی وجود کی بقا اور بہترین شخصیت کی تکمیل اور حیاتِ ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔محض انفرادی شخصیت یعنی خودی کی تعمیر ہی نہیں بلکہ کل بنی آدم کی محبت واحترام اور خیر خواہی کو بھی انسان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔اقبال کی فکر قرآن کے اس پیغام کو واضح طور پر پیش کرتی ہے۔اسی لیے فکرِ اقبال کی اساس اسلام کے احکام وتعلیمات سے مرکوز ہے۔حیات وکائنات کا تصور چوں کہ احترام آدمیت کے بغیر ادھورا ہے اسی لیے اقبال کہتے ہیں۔مذہب چیست؟ احترامِ آدمیت قرآن کے اس آفاقی پیغام کی اہمیت فکرِ اقبال میں جابجا موجود ہے۔قرآن مجید کے اس امتیازی پیغام کے ضمن میں

اقبال نے کہا تھا۔قرآن سے پہلے کسی ارضی وسماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی قرآن کریم نے اطلاع دی۔ یہ لفظ تم قرآن کے سوا کہیں نہ دیکھو گے۔ **وسخرلکم مافی السمٰوٰتِ والارض** : آج تک تم جن ارضی وسماوی مہیب یا مفید ہستیوں کو اپنا معبود سمجھتے رہے ہو وہ سب اور تمام دیگر کائنات تمہاری خدمت کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔توحید کا یہ مرتبۂ اعلیٰ ماسوا سے بے پرواہ کردینے والا انسانی خودی کا یہ حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آتا (ملفوظاتِ اقبال ص۔۶۴)

اقبال کے فکر وفلسفہ میں احترام آدمیت، مردِ مومن، مردِ کامل، حرکت وعمل وغیرہ تصورات خودی کے مرکزی تصور ہی رونما ہوتے ہیں۔اقبال کا مردِ مومن سراپا قرآن ہے فرماتے ہیں۔

یہ راز کس کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال نے اپنے خطبات میں قرآن کے حقیقی مقصد کے ضمن میں یہ واضح کیا ہے کہ ''قرآن کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندران گونا گوں روابط کا ایک اعلیٰ وبرتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں قرآنی تعلیمات کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے بہ اعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن سے کہا تھا''تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خالی نہیں۔ ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف ہے کوئی بھی انسان اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔''لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پاک کے نزدیک اس کائنات کی جس میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں نوعیت کیا ہے۔اوّل یہ کہ اس کی آفرینش اس لیے نہیں ہوئی کہ تخلیق کا عمل ایک کھیل ہے...وہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔اور اس کی تحریک بھی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔'' (**یزید فی الخلق ما یشاء** ص۔۵۶۔۵۵۔۵۳)

کلامِ اقبال میں فکرِ اقبال کی اسلامی اساس میں بالخصوص قرآن اور حدیث رسول پاکؐ سے استنباط اور اخذ واستفادے کو بالواسطہ اور بلاواسطہ متعدد جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔قرآن وحدیث دیگر اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، مذاہب وادیان کی تاریخ وغیرہ کے پس منظر اور تناظر کو سمجھے بغیر کلامِ اقبال کی تفہیم آسان نہیں۔بطور استناد اس ضمن میں متعدد اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔لیکن اس مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ کرنا سخت مشکل ہے۔یوں بھی فکرِ اقبال کی اسلامی اساس ایک وسیع تر تحقیقی موضوع ہے اور ایک طویل علمی وتحقیقی مطالعے کا متقاضی ہے۔یہاں تو بس بطور نمونہ چند مثالیں اردو وفارسی دونوں کلام میں سے پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

چشم اگر بیناست ہر شے دیدنی است در ترازو زبے نگہ سنجیدانی است

یہاں دلِ بینا اور چشم بینا میں قرآن کی اس آیت سے استفادہ ہے۔ **فانها لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور** ۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔ (الحج:۴۵)

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا — آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی
عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

بندۂ مومن کی حق پرستی، عقیدۂ توحید اور کفر وشرک سے اجتناب سے متعلق اپنے فکر واحساس کے اظہار میں اقبال نے قرآن کریم کی اس آیت سے روشنی حاصل کی ہے۔ **وَلا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً آخر لآاِلٰہَ اِلا ھُو کُلُّ شَئِیٍ ھَالِکٌ اَلا وَجْھَہٗ** (اور خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارنا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ (القصص:۸۸)

ان اشعار کی فکری اساس قرآن کی یہ آیت ہے **صبغة اللّٰہ ومن احسن من اللہ صبغة ونحن لہٗ عابدون** (کہدو کہ ہم نے تو خدا کا رنگ (اختیار کرلیا ہے) اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں) (البقرۃ:۱۳۸)

ان اشعار میں کلام پاک کی یہ آیت پیش نظر رہی ہے۔ **لن تنا لوا البِرَّ حتّیٰ تُنفقوا مِمَّا تُحِبّون** ۔ (تم نیکی اس وقت تک حاصل نہ کرسوگے نیکی کے معیار تک نہیں پہنچ سکوگے جب تک کہ (راہِ حق میں) اپنی عزیز ترین چیزوں کو خرچ نہ کردو) (آلِ عمران:۹۲)

ان اشعار میں کلامِ الٰہی کی اس آیت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ **قلنا یا نار کونی برداً وّسلٰماً علیٰ ابراھیم** (ہم نے آگ کو حکم دیا کہ ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم کو سلامت رکھ) (الانبیاء:۶۹)

علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش — کشتی مسکین وجانِ پاک ودیوار یتیم

ان تین لفظی تراکیب میں حضرِ خضر کی شان میں قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے درمیان بیان کیے گئے ایک طویل واقعہ کو پیش کیا گیا ہے۔ (سورۂ کہف۔۸۲۔۶۵)

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق — آوازِ کن ہوئی تپشِ آموز جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کہ بہار دیکھ — اک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ان اشعار میں لفظ **کن**، اس آیت کی تفسیر ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس

سے فرما دیتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ **انما امرہٗ اذا ارادشیئا ان یقول لہٗ کن فیکون** (یٰسین:۸۲)

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا   بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اس شعر کا محرک یہ آیت ہے۔ **وما ارسلنک الا کافۃً للناس بشیراً ونذیراً** اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام عالم کے لیے خوش خبر دار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا:۲۸)

آن نگاہش سرّ مازاغ البصر   سوئے قومِ خویش باز آید دگر

تاز مازاغ البصر گیرد نصیب   بر مقامِ عبدہ گردد رقیب

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے   تری نظر کا نگہبان ہو صاحبِ مازاغ

'مازاغ' کے اس مختصر کلمے کی تفسیر و تفہیم کلام پاک کی اس آیت کے بغیر ممکن نہیں۔ **مازاغ البصر وماطغیٰ** (ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔ (النجم:۱۷)

مردِ حر محکم ز ورد لاتخف   بمیداں سر بجیب او سر بکف

می دہد مارا پیامِ لاتخف   می رساند بر مقام لاتخف

درسِ لاخوف علیھم می دہد   تادلے در سینۂ آدم نہد

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود   قلبِ او از لاتخف محکم شود

اقبال کا یہ فکر و احساس کلام الٰہی کی اس آیت سے مستعار ہے۔ **فاوجس فی نفسہٖ خیفۃ موسیٰ. قلنا لاتخف انک انت الاعلیٰ** (اس وقت موسیٰ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا ہم نے کہا خوف نہ کرو بلا شبہ تم ہی غلاب ہوگے) (طہٰ:۶۸-۶۲)

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار   ہر زماں پیشِ نظر **لایخلف المیعاد** دار

ایمان و یقین سے متعلق اپنے احساس کو پیش کرتے ہوئے اقبال نے یہاں قرآن کی اس آیت سے استفادہ کیا ہے۔ **ان اللہ لا یخلف المیعاد** (آل عمران:۹) بیشک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

باطن از ارض الا اللہ ظاہرست   ہر کہ ایں ظاہر بنید کافر است

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

حکومت و سیاست سے متعلق اپنے تصورات کو اسلامی احکام کی روشنی میں پیش کرنے کے لیے اقبال نے اپنی فکر کو قرآنِ حکیم اس آیت سے مستفید کیا ہے۔ **ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ** (بے شک زمین تو اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے۔ (اعراف:۱۲۸)

مرگ را ساماں زقطع آرزوست　　　زندگی محکم تراز لاتقنطوا

اقبال کے اس فکر و پیام میں کلامِ الٰہی کی یہ آیت جلوہ گر ہے۔ کہہ دیجئے !اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے وہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔　　　(الزمر:۵۳)

اسلامی تعلیمات وقرآنی احکام سے مربوط اور منضبط فکرِ اقبال اپنی سیرت وسوانح کے ہر موڑ پر عشقِ رسول سے سرشار نظر آتی ہے۔حضورِ رسالتِ مآب کی ذات اقدس ہی دراصل اقبال کے مردِ مومن اور مردِ کامل کی معراج ہے ۔اقبال کے نزدیک حضرت محمدؐ کی سیرت مبارک دانائے سبل، ختم الرسل اور مولائے کل ہے جس کے طفیل غبار راہ کو فروغ وادیِ سینا حاصل ہوا سیرتِ رسول پاکؐ چوں کہ قرآن کی تفسیر اور عملی تعبیر ہے اس لیے اس ذاتِ اقدسؐ سے عشق وعقیدت بھی اقبال کی فکری اساس کا اہم جزو ہے جذب وشوق کا عالم کہ اسی متاعِ عشق کو وہ اپنے فکری قافلے میں لٹانے اور ٹھکانے لگانے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں عشق رسول اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے متعلق اقبال کے جذب وشوق کی سیمابی ان کے فکر و پیام اور کلام میں جابجا موجزن ہے۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　　حاملِ او رحمت اللعالمین
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا　　　اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
کافر ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق وشوق　　　دل میں صلوٰۃ و درد ولب بہ صلوٰۃ ودرود
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے　　　غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر　　　وہی یسیں وہی فرقاں وہی قراں وہی طٰہٰ

اقبال نے شعر کے محدود وتنگ دائرۂ الفاظ میں وسیع وبلند مفاہیم اور معانی ومطالب کو نہ صرف کلامِ الٰہی قرآن مجید کی متعدد آیات بلکہ احادیث رسول اکرمؐ سے بھی خاطرخواہ استفادہ کیا ہے البتہ حدیث کے معاملے میں وہ اس کی استناد اور تحقیق کے قائل تھے۔احادیثِ مبارک سے اخذ واستفادہ اور فکری اساس پر مبنی چند اشعار یہاں بطور نمونہ پیش کیے جارہے ہیں۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی ست　　　لا تسبوالدھر فرمانِ نبیؐ ست

اقبال نے اپنے فکر و پیام میں فلسفۂ زمان ومکاں کی تشریح وتوضیح میں اس حدیث پاک سے استفادہ کیا ہے۔زمانے کو برامت کہا کرو۔کیوں کہ اللہ ہی (مالکِ) زمانہ ہے۔

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر　　　ہست شیطاں از جماعت دور تر

اقبال نے اپنے فلسفۂ بے خودی یعنی حیات اجتماعی کے بیان میں حدیث پاک کا استفادہ کیا ہے۔مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہے۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں　　　باگ ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے پیارا

سمان الفقر فخری کے یہ الفاظ اس حدیثِ پاک سے مستعار ہیں فقر میرا فخر ہے اور میں اس پر فخر کرتا ہوں۔

آہ یورپ ایں مقام آگاہ نیست　　　چشم او ینظر بنور اللہ نیست

ینظر بنور اللّٰہ میں یہ حدیث پاک پنہاں ہے۔مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ وہ اللہ کے نور کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔

قرآن وحدیث کے علاوہ متعدد پیغمبرانِ عظام حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ وغیرہ بھی فکر و پیام اور کلام اقبال کے اہم اجزاء ہیں چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کرمکتب کی کرامت تھی　　　سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

ملائکہ اور ملکوتی صفات کی اہمیت کے باوجود اقبال کا فکری پیکر پیکر نوری کے مقابلہ فضیلت آدم کا آئینہ دار ہے۔

راز دارِ علم الاسما کہ بود　　　مستِ آں ساقی وآں صہبا کہ بود

مدعائے علم الاسما ستے　　　سر سبحان الذی اسرا ستے

رسولِ کریمؐ کے زیر تربیت اصحاب سیرت وکردار خلفائے راشدین ودیگر صحابہ کرام بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ وغیرہ بھی اقبال کے فکر وشعور کا حصہ ہیں۔نیز ائمہ اربعہ اور متعدد بزرگانِ دین، اولیائے کرام سے بھی فکر اقبال مستفید ہے۔

ڈاکٹرنسرین بیگم
آگرہ

اقبال کا پیغام محبت

اقبال کی پیامی حیثیت ایک علامت بن چکی ہے۔فکر وشعور میں یہ حیثیت ایک استعجاب ہے کیوں کہ فلسفہ پیامی نہیں ہوتا وہ حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے۔شعر بھی ادبی جمالیات کا مظہر ہوتا ہے۔اس میں دعوتِ دین یا فکر ونظر کی تبلیغ کی گنجائش نہیں ہوتی۔مگر یہ تخلیق کی حیرت کشائی ہے کہ اقبال نے دونوں مسلم روایتوں کا انحراف کرتے ہوئے خطاب وترسیل کو ان کا حاصل بنا دیا۔اقبال کا بنیادی فلسفہ خودی ہے جس کے بڑے دل کش روپ اور امتیازات ہیں۔ اس کے ارکان واسناد بھی مختلف ہیں۔لیکن خودی جس سے استحکام واقرار حاصل کرتی ہے وہ محبت ہے۔گویا خودی کا ملزوم عنصر محبت ہے۔اس محبت کے پیغام سے ان کی پوری شاعری جلوہ نما ہوگئی ہے۔اس کے بھی ہزاروں پہلو ہیں۔ یہاں چند عناصر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

۱۹۰۴ء میں لکھی گئی ''تصویر درد'' علامہ اقبآل کی مشہور ومعروف طویل نظم ہے۔جو کلیات اقبال کے مجموعہ بانگِ درا میں شامل ہے۔یہ نظم اردو کی انقلابی آواز بن کر سامنے آئی۔انگریزوں کے ظلم وستم اور ان کی نفرت کے شکار ہندوستان کی پوری تصویر ''تصویر درد'' میں ابھرتی ہے۔اقبآل کا یہ شعر ہماری مکمل اور بہتر زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔خواجہ الطاف حسین حالؔی کا یہ شعر دیکھیے۔

بیٹھے کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

لفظ دوست میں خلوص، ایثار، محبت واپنائیت سب کچھ ہے۔یہ اپنے آپ میں مکمل ہے۔اقبآل تو کسی قوم کا شاعر نہیں وہ تو تمام دنیا کا شاعر ہے۔انہوں نے اپنے دل کے درد کو جس طرح شعر میں ڈھالا ہے وہ آج بھی کارگر اور تازہ ہے۔کیونکہ فرقہ پرستی کا بادل آج بھی منڈلا رہا ہے۔اقبآل نے اردو شاعری کی ایک نئی طرح ڈالی اور محبت ہی

سے سارے مسائل کا حل نکالا۔نظم ''تصویر درد'' کے ایک ایک شعر میں ایک داستان پوشیدہ ہے۔اقبالؔ نے بآوازِ بلند کہہ دیا کہ اگر ہم فرقہ پرستی سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ پائے تو ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔انہوں نے ہندوستانیوں کو آگاہ کر دیا۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے ہمیشہ قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی ترقی اسی میں ہے کہ ہم سب مل کر رہیں۔قوم کی پسماندگی،غربت وافلاس کا علاج کیسے ہو؟ اقبالؔ کا بے حد اہم مضمون جس کا عنوان ''قومی زندگی'' ہے۔یہ مضمون ''مخزن'' میں شائع ہوا۔اس مضمون میں اقبالؔ نے لکھا ہے کہ وہ کون سی قومیں ہیں جو زوال پذیر ہونے کے بعد اس سے نکل آئیں اور نئی زندگی حاصل کی ہے۔یہ بات اہم ہے،جس طرف اقبالؔ نے نشاندہی کی ہے وہ یہ کہ جب تک آپس میں بکھراؤ ہوگا،ہم نئی زندگی تلاش نہیں کر سکتے۔اور نئی زندگی کو تلاش کرنے کے لیے اقبالؔ نے احساس،نفس،خودی ودانا جیسے الفاظ کا سہارا لیا اور کہہ دیا کہ اگر ہم اپنی قوم میں نیا احساس جگائیں اور ماضی کی تمام وارثت کو سنبھالتے ہوئے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیں اور اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور یہ واضح کر دیں کہ ہم محبت سے ہی فتح حاصل کر سکتے ہیں۔اور یہ بھی واضح کر دیں کہ نفرت سے دوریاں بڑھتی ہیں۔اور جب دوریاں بڑھتی ہیں تو ترقی کے راستے تنگ ہو جاتے ہیں بلکہ بند ہو جاتے ہیں۔لوگ نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتے ہیں۔ہم ترقی یافتہ ملکوں سے پیچھے چلے جاتے ہیں۔آج یہ سوال جواب طلب ہے کہ ہم پسماندہ کیوں ہیں؟

اقبالؔ نے نظم نیا شوالہ 'ترانۂ ہندی'،صدائے درد،تصویر درد اور ہندوستانی،بچوں کا قومی گیت،جیسی نظمیں لکھیں۔جولافانی ہیں۔

اقبالؔ نے تصویر درد میں اپنے دل کے درد کو جس طرح اشعار میں ڈھالا ہے وہ جذبہ آج بھی تازہ ہے کیونکہ فرقہ پرستی کا بادل آج بھی منڈلا رہا ہے۔اگر ہم فرقہ پرستی سے اپنے آپ کو محفوظ نہ دکھ پائے تو اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی خوشبو سے بھی محروم ہو جائیں گے۔اس بیماری سے بچنے کا واحد علاج علامہ اقبالؔ نے صرف 'محبت' بتایا ہے

محبت یعنی ایک دوسرے سے اپنے ملک سے۔

''محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے''

اس محرومی سے نکلنے کا واحد علاج محبت ہی ہے۔اس لیے ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھو، نفرت اور تعصب سے ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔اس حقیقت سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا کہ بیمار اور بدحال قومیں محبت اور اتحاد سے ہی اپنے کھوئے ہوئے وجود کو حاصل کر سکتی ہیں۔اپنی سوئی ہوئی قسمت کو انہیں قوموں نے بیدا کیا ہے۔جنہوں نے اس شعر کے مفہوم کو سمجھ لیا ہو۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے

ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

اقبالؔ نے اس سرزمین پر رہنے والے ہر خاص و عام کو یہی پیغام دیا مثلاً ''دھرتی کے باسیوں کی مکتی پر یت میں ہے''۔محبت وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہمیں مکتی حل سکتی ہے۔لہذا جب ہم یہ جانتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں کہ پریت میں ہی ہماری مکتی ہے تو پھر یہ نفرت کیوں؟ آج نفرت ہی کہ وجہ سے ہجومی تشدد اپنا پیر جما چکی ہے۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نفرت کی کھیتی کر کے امن کی فصل نہیں کاٹی جا سکتی ہے۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ملک کی ترقی امن وآشتی میں ہے۔جب تک ہم مذہب کا غلط استعمال کرنا نہیں چھوڑ دیں گے تب تک ہمارے خوبصورت مل ہندوستان میں امن وامان قائم نہیں رہ سکتا۔شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے مذہب کو سیاست سے علاحدہ کرتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

یہ ہندوستان ہمارا ہے۔ہمیں چاہئے کہ امن کا ماحول قائم کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ہم اس سرزمین پر پیدا ہوئے۔ہم زندگی کی آخری سانس تک اپنے وطن ہندوستان سے محبت کرتے رہیں گے۔لوگون کو یہی پیغام دیتے رہیں گے۔اقبالؔ نے زندگی اور کائنات کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کیا تھا۔بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو شاعری میں ادبی، سیاسی اور سماجی بیداری کا آغاز علامہ اقبالؔ کا مرہون منت ہے۔انہوں نے یہی پیغام دیا کہ اے لوگو! جب تک تمہارے جسم میں جان باقی ہے یہ یاد رکھنا۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

پر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

اقبالؔ قوم کی بدحالی کو دیکھ کر دردمند تو تھے ہی مگر ساتھ ہی اس بدحالی سے نکلنے کے لیے محبت اور بھائی چارہ

وحوصلے کو بلند رکھنے پر زور دیتے رہے اور نکلنے کا راستہ بتاتے رہے اور یہ احساس دلاتے رہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ محبت کا پیغام دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی ترقی اسی میں ہے کہ ہم سب مل کر رہیں۔ انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! تمام بیماریوں کا علاج صرف اور صرف محبت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ محبت، خلوص اور اتحاد سے ہی ہم اپنے کھوئے ہوئے وجود کو حاصل کر سکتے ہیں۔ نفرت اور تعصب سے ہم اپنے اندر کی خوبیوں کو بھی ختم کرتے چلے جائیں گے۔ سرسید نے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان ہماری دو آنکھیں ہیں اور ہندوستان خوبصورت دلہن۔ اگر دلہن کی ایک آنکھ بھی خراب ہوگئی تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دلہن کیسی ہوگئی۔ فرقہ پرستی اور تعصب سے ہمیشہ ہمارا نقصان ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اقبالؔ نے ہمیشہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کو یہی پیغام دیا۔

تعصب چھوڑ ناداں ! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

محبت اور اتحاد سے ہی ہم منزل حاصل کر سکتے ہیں۔ جس نے اس راز کو سمجھ لیا یقیناً وہ اپنا، اپنے خاندان کا، اپنے وطن کا اور اپنے ملک ہندوستان کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ایک سچے ہندوستانی کے لیے ایسا کرنا لازمی ہے۔ خاص طور پر ''بانگِ درا'' کی جتنی بھی نظمیں ہیں وہ با مقصد ہیں۔ اور یہ پوری دنیا جانتی مانتی اور سمجھتی بھی ہے کہ اپنے وطن ہندوستان کی عظمت اور شان میں اتنے خوبصورت اور پر معنی الفاظ کا استعمال شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ مگر اقبالؔ کے یہاں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ علامہ اقبال نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب انسان سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ چاہے ہم جس بھی مذہب کے ماننے والے ہوں، منزل تو ایک ہی ہے۔

جہاں چلتے چلتے زندگی کا سفر ختم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی مٹی میں تو محبت کا ہی خمیر ہے۔ جس کے دل میں محبت نہ ہو وہ سچا ہندوستانی ہو ہی نہیں سکتا۔ گویا ہم ہندوستانی ہیں تو محبت ہمارے رگوں میں، ہمارے دل و دماغ میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنا پرچم ہر محاذ پر لہراتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن سے انسانی رواداری، انسانیت اور مروت، یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کا ہمیشہ درس ملتا ہے۔ اقبالؔ کا پیغام محبت ہمیں حوصلہ دیتا ہے۔ ہم مسلسل زندگی کے سفر کو جاری رکھیں۔ ہماری ترقی بھی اسی میں ہے کہ

ہم مل کرر ہیں۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ہمیں اسے قائم رکھنا ہے۔اگر ہمارے اندر اتفاق واتحاد کم ہوگا تو ہمارا ملک کمزور ہوگا۔اقبالؔ نے ’’بانگِ درا‘‘ میں نظم ’’محبت‘‘ میں کیا خوب لکھا ہے۔

چمک تارے سے مانگی ، چاند سے داغ جگر مانگ
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برنم سے
تڑپ بجلی سے پائی ، مور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابن مریمؑ سے
ذرا سی پھر ربو بہت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی ، افتاد گی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیوان کے پانی سے
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

کلیات اقبالؔ بانگِ دراص۔۱۱۱

اقبالؔ کا پیغام محبت یہی ہے کہ ہم ایک نیک اور سچے انسان بنیں۔محبت ہی ہماری زندگی ہے۔اقبال کی نظم ’’بچے کی دعا‘‘ تو پوری دنیا کے لیے محبت پیغام کو بانٹتی ہے اور لب پر یہی بات آتی ہے۔

اقبال کی نظم ’بچے کی دعا‘ بے حد مقبول ہوئی۔مگر آج کے ماحول اور افراتفری میں ہم ان باتوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔یہ ہمارے ملک کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔تو ہمیں چاہئے کہ اس نظم کو ہر خاص وعام بچوں تک پہنچایا جائے جس سے ان کے دل میں ابتداء سے ہی محبت اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا ہو۔یہ نظم پوری دنیا کے لیے پیغام ہے۔آج اہل وطن کو خواب غفلت سے جگانے کی پھر ایک بار ضرورت آپڑتی ہے۔انہیں ماضی اور اس کی زنجیروں اور فرسودہ روایات سے منقطع ہونے کی تعلیم دیں۔ملک کے اندر امن وآشتی کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر عبدالحیٔ
نئی دہلی

فکرِ اقبال کا اساسی پیغام

مطالعۂ اقبال ہماری حیرتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ فلسفے کو جذبے کی زبان میں ڈھلتے یا شعر کا فلسفے کے مجرد و غیر مجرد موضوعات کو کمندِ تخلیق میں اسیر کرتے نہیں پایا گیا۔ دو چار مثالیں منفرد اشعار کی صورت میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شعری زبان میں مربوط نظامِ فکر ایک جنسِ نایاب ہے۔

دوسری حیرت بھی کم نہیں ہے فلسفۂ گہرے اور پیچیدہ خیالات کو متصور کرنے کا نام ہے اسے بھرپور شدت کے ساتھ پیغام رسانی کے رگِ خون میں شامل کر کے انقلاب و اضطراب کا وسیلہ قرار دینا مشاہدے میں نہیں ہے۔ اس انقلاب کی نسبت فکر و نظر سے کم اور پیام و احکام سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں مثال زیرِ مطالعہ شعر ہے جو پیامِ زندگی ہی نہیں رمزِ کائنات کی اسرار کشائی بھی کرتا ہے۔

اقبال کی مشہور و معروف نظم ''خضرِ راہ'' سے لیا گیا یہ مصرع اپنے آپ میں گہرے اور وسیع مفاہیم رکھتا ہے۔ یہ مصرع اور اس طرح کے سیکڑوں مصرعے اقبال کی نظموں، غزلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ شاعر اور حضرت خضر کے درمیان ہونے والے مکالمے پر مشتمل یہ نظم ہمیں زندگی میں جدوجہد کرنے اور کوشش کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہمیں دوسروں کے بھروسے نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہئے، اگر ہمیں کامیابی حاصل کرنی ہے تو قوتِ عمل سے کام لینا ہوگا۔

آل احمد سرور نے اسی نظم کے حوالے سے کہا تھا کہ اقبال کا فن پہلی دفعہ اپنی بلندی پر نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس نظم کو اردو شاعری کا عہد نامہ جدید کہتے ہیں وہیں مسعود حسین خاں نے اسے اردو میں قرآن نازل ہوتا تو اقبال کی نظم یا ابوالکلام کی نثر کا پیرایہ اختیار کرتا۔ حالانکہ کلیم الدین احمد کو اسی نظم میں ڈھیر ساری کمیاں بھی نظر آئیں لیکن عبدالمغنی نے اپنی کتاب میں کلیم الدین احمد کی اس تنقید کا مفصل اور بھرپور جواب دیا ہے۔ اقبال کے اولین شعری مجموعے 'بانگ دار'' میں آٹھ طویل نظمیں ہیں جن میں 'خضرِ راہ' ایک ہے۔ (دیگر نظمیں یہ ہیں تصویرِ درد، گورستانِ شاہی، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، طلوعِ اسلام ان تمام نظموں میں اقبال قوم و ملت کو سنوارنے اور انہیں سیدھی راہ پر لانے کی کوشش میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں، جس طرح کے استعارے اور تشبیہات انہوں نے استعمال کی ہیں انہیں پڑھ کر کسی بھی شخص کے خون میں روانی پیدا ہو جائے گی۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ساری دنیا میں پھیلے دیگر مذاہب کے ماننے

والوں کو قرآن پاک اور احادیث نبوی کی تعلیمات دی ہیں۔ اقبال کا کمال فن یہ ہے کہ وہ ایک مصرعے میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جس پر پوری کتاب بھی کم پڑ جائے۔ علامہ اقبال برصغیر کے ہی نہیں بلکہ دنیا میں پیدا ہونے والے اہم مفکرین میں سے ایک ہیں۔ ان تمام فکری اور علمی موضوعات کا احاطہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ اقبال کی شاعری اور ان کی فکر کے حوالے سے مختلف شخصیات نے اپنے اپنے انداز میں اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی بھی اقبال کی فکر کو مکمل طور پر سمجھنے اور اس کی تفہیم کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اقبال کی فکر کی صحیح اور حقیقی تفہیم تبھی ممکن ہے۔ جب اقبال کی شاعری کو پڑھنے والے مشرق و مغرب کے مختلف علوم و فنون سے آشنا ہوں کیوں کہ اقبال کی شاعری میں ان علوم و فنون کا جابہ جا ذکر ملتا ہے۔ اقبال جب کوئی شعر کہتے ہیں تو وہ محض ایک شعر نہیں ہوتا بلکہ ایک جہان معنی اس کے پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ ان کی شاعری اور ان کی فکر کا محور قرآن وحدیث ہوتے ہیں۔ وہ بھلے ہی دنیا کے کسی فلسفی، شاعر، مفکر کا حوالہ دیں لیکن قرآن وحدیث ہی ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ اقبال یہ بھی چاہتے ہیں کہ دنیا کی دیگر اقوام نے جس طرح ترقی حاصل کی ہے اسی طرح مسلم قوم بھی عروج کی نئی داستان رقم کرے۔ اس لیے اقبال دوسری تہذیبوں اور مذاہب کی تعلیمات دیتے ہوئے نہیں گھبراتے کیوں کہ حضور اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ تمہیں اچھائی اور نیکی جہاں سے ملے حاصل کرو۔

انسانی زندگی حرکت وعمل کا دوسرا نام ہے۔ ہمارا مذہب اسلام بھی حرکت وعمل کی دعوت دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اسلام کی اس بنیادی روح کو سمجھتے ہوئے ملت اسلامیہ کو حرکت وعمل کی دعوت دی۔ اسلامی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی ملت اسلامیہ نے اپنے زور بازو اور خدا سے بھروسہ توڑا ہے اسے نقصانات وذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاتاریوں کا حملہ ہو یا پھر مغربی ممالک کی پیش قدمی۔ تاتاریوں کے حملے نے اسلام کی مرکزی اکائی کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں کے کتب خانوں کو ان کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلمانوں میں وہ بنیادی تعلیمات موجود تھیں جس نے روم، مصر اور اندلس کو فتح کرایا تھا۔ ان حملوں سے ایک سبق لیتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمانوں نے ایک ہو کر پھر سے اسلام کا پرچم بلند کیا لیکن 18 ویں صدی تک آتے آتے اسلام کی یہ اکائی بھی دم توڑ گئی کیوں کہ مغربی معاشرہ، صنعتی وسرمایہ دارانہ انقلاب اور سائنسی رویوں نے ایک ساتھ مل کر عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور اس میں اسے کامیابی ملی۔ تاتاریوں نے ظلم وبربریت کا ننگا ناچ تو کیا لیکن وہ اسلام کی روح کو نقصان نہ پہنچا سکے لیکن مغربی معاشرے نے وہ کام کر دیا جو تاتاریوں کی تلوار نہ کر سکی۔ ان تمام صورتِ حال نے مسلمانوں کو مایوسی اور ناامیدی کی گہری دلدل میں دھکیل دیا۔ اس صورتِ حال سے مسلمانوں کو باہر نکالنے میں اردو ادب کے حوالے سے

پہلا نام سرسید احمد خاں کا آتا ہے۔انہوں نے مغربی تہذیب وتمدن کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور مسلمانوں کو پھر سے ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کا آغاز کیا۔ سرسید کی ان کوششوں کا ذکر یہاں بے محل ہوگا۔مختصر یہ کہ سرسید نے مغربی تہذیب کی یلغار سے نکلنے کی یہ صورت بتائی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم اور سائنس کی طرف راغب کیا جائے اور اس کوشش میں وہ مذہب کو بھی سائنس کے تناظر میں دیکھنے لگے جس سے مسلمانوں میں خلفشار پیدا ہوا اور خود ان پر کفر کے فتوے لگے۔

بیسویں صدی پوری دنیا میں نئے ہنگامے اور نئے انقلابات لے کر آئی۔ دنیا کے سیاسی نقشے میں کئی ردو بدل ہوئے اور دنیا نے پہلی جنگ عظیم کا سامنا کیا۔ ہندوستان بھی نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ان تبدیلیوں اور نفسانفسی کے عالم میں اقبال وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان رویوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کی بے بسی اور گمراہی کو دور کرنے کی کوشش کی اور فلسفہ خودی، عشق و عقل، مردمومن، حرکت وعمل جیسے تصورات پیش کیے اور قرآن واحادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا اور ایک نئی تعبیر پیش کی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں رولٹ ایکٹ، گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک، جنرل ڈائر کا مارشل لا اور قتل عام جیسے واقعات سے ملک میں افراتفری کا ماحول تھا اور ایسے وقت میں ہی اقبال نے یہ نظم تحریر کی اور ہمیں خواب خرگوش سے جگانے کی کوشش کی۔خضر راہ کے حوالے سے راشد حمید لکھتے ہیں:

> ’’علامہ اقبال نے اپنے تخلیقی رویوں کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا اور ابتداً وہ مروج اصول وضوابط کے مطابق شعر کہتے رہے لیکن بہت جلد وہ اس سلسلے کو خدا حافظ کہہ آئے اور نئے رنگ اور نئی تخلیقی اپج کے ساتھ سامنے آئے۔خضر راہ علامہ اقبال کے انقلاب آفریں فلسفے کا بنیادی نکتہ ہے۔ انہوں نے اس نظم میں اسلام کے حرکی کردار پر گفتگو کی۔علامہ اقبال اس حوالے سے غور وفکر کرنے اور نتائج نکالنے میں یوں کامیاب اور کامگار ٹھہرے کہ انہوں نے تاریخ کا جو تہذیبی مطالعہ کر رکھا تھا اور اسلام کے جس تصور تاریخ سے وہ آگاہ تھے، اس کے پس منظر میں انہوں نے ایک نیا زاویۂ نگاہ وضع کیا اور اس کی تدوین اور ترتیب وتہذیب کی بنا پر وہ کچھ ایسے نئے رویے سامنے لائے کہ جن کے مسلم امہ پر نہایت دوررس اثرات مرتب ہوئے۔‘‘ (بحوالہ: اقبال کا تصور تاریخ: راشد حمید)

اسلامی تعلیمات گواہ ہیں کہ اس مذہب میں کس قدر رواداری اور وسعت ہے ۔تعصب اور تنگ نظری کی اسلام میں کبھی کوئی گنجائش نہیں ۔ یہاں تک کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر بھی لعن طعن کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔لیکن خود اسلام کے پیروکار ہی اپنے دینی بھائیوں سے تعصب رکھنے لگے تو اقبال کو شکوہ کرنا پڑا۔

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اور جب مسلمان ذاتی مفادات میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں مطالب قرآن کو بھی ذاتی مفاد کے رنگ میں ڈھال لیا تو اقبال کہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں ، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

بیسویں صدی میں جہاں دنیا ترقی کے نئے زینے چڑھ رہی تھی ، وہیں مذہب اسلام میں نئے فتنے سر اٹھا رہے تھے ۔ ہر کوئی اپنی فکر کو صحیح ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ مذہب جیسے ذاتی جاگیر بن کر رہ گیا تھا۔ان حالات میں اقبال فرماتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں ! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اقبال ایک بالغ نظر شاعر ہیں ۔انہوں نے نہ صرف مشرق کی تعلیمات اور فلسفے کو پڑھا ہے بلکہ فلسفہ مغرب بھی ان کے دل و دماغ میں بھی رہا ہے۔ وہ علم کو مضامین یا علاقائیت سے پرے سمجھتے ہیں اور جہاں اس سے انہیں کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ لے لیتے ہیں۔ وہ تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔فلسفہ ان کے حافظے میں ہے۔اقتصادیات سے انہیں گہرا شغف ہے۔دنیا کے نئے رجحانات و رویوں سے بھی واقف ہیں، جمہوریت، اشتراکیت، شہنشاہیت غرض ہر طرز حکومت سے وہ آشنا ہیں۔ یہی نہیں قدیم ہندوستانی، چینی، یونانی، فلسفہ و نظریات سے بھی واقف ہیں۔انہوں نے دنیا کی مختلف اقوام کا مشاہدہ کر کے جو نتائج برآمد کیے ہیں اسے شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری صرف غزل، قصیدہ یا مرثیہ نہیں ہے بلکہ انسان کے دکھوں کا مداوا ہے، انسان کی آزادی، خوشی اور طمانیت ان کی شاعری کا مقصد ہے۔اقبال اپنے علم، تجربے اور تدبر کی مدد سے ایک راہ عمل ترتیب دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ انسان کی تمام پریشانیوں کا حل اس کے عمل میں پنہاں ہے۔ اگر انسان سچے دل سے کوشش کرے تو منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔بس اسے اپنے عمل کے تئیں خود اعتماد رہنا ہوگا۔ اپنے زور بازو سے یقین کامل رکھنا ہوگا اور اللہ پر پورا

بھروسہ رکھنا ہوگا۔ پھر چاہے پہاڑوں یا بحرِ ظلمات سبھی جگہ فتح وکامرانی ہمارے قدم چومے گی۔ ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

’’اقبال کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب تک اس جہان نو کی امامت وقیادت مردمومن کے ہاتھوں میں نہیں آتی اس وقت تک یہ انسانیت ان فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت وبربادی سے دوچار ہوتی ہی رہے گی۔ ضرورت ہے کہ مردمومن اٹھے اور ایک جہان نو کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن کر اٹھے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے۔‘‘

(نقوش اقبال:علی میاں ندوی،ص۔۱۳۲)

نظم ’خضر راہ‘‘ کے حوالے سے علامہ اقبال کا یہ پیغام ہے کہ اگر انسان فنا ہوجانا چاہے تو بے لگام زندگی گزارے اور انسان چاہتا ہے کہ باقی رہے تو اصول اور قاعدے کے تحت زندگی بسر کرے۔ اسی میں انسان کی بھلائی ہے۔ زندگی کا دوسرا نام عمل ہے اور اگر انسان کی زندہ رہنا ہے تو اسے اپنی دنیا آپ پیدا کرنی ہوگئی اور اس دنیا کے لیے عمل ضروری ہے۔ اور عمل ہی انسان کو حیات بخشتا ہے۔ بہ قول عزیز احمد

’’اقبال کا سارا کلام پڑھنے کے بعد ایک سیدھی سادی بات جو عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے۔ خدا اور اس کے رسولؐ سے عشق رکھے۔ اسلامی تعلیمات کی حرکی روح کو سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت میں خدا کا جانشین بن سکتا ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک بن سکتا ہے۔‘‘

(عزیز احمد)،کلیات اقبال،اقبال اکادمی

اقبال رنگ ونسل وقومیت کے ہی نہیں ارض وسما کے حدود کو بھی توڑنے کا پیغام دیتے ہیں۔ مشرق ومغرب ہو یا شمال وجنوب کی ہر تفریق کے خلاف ان کا احتجاجی نقطۂ نظر قابلِ تحسین ہے وہ محبت کی رسموں کو ترکی وتازی سے ماورا بناتے ہیں۔ یہ محبت بنی نوع انسان کی ازلی میراث ہے جس کی بقا کے لیے انسان مبعوث کیا گیا ہے۔ انسانوں کے آدابِ محبت میں حائل ہر شے کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کی آرزو ان کے اضطرابِ فکر کی آواز ہے۔

اس شعار زمین وآسماں کو خاکستر بنانے کا پیغام اقبال نے دیا ہے۔ اگر یہ ارض وسما ہمارے موافق نہ ہوں تو

نئی دنیا پیدا کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کی بے پناہ خواہش کلام اقبال کو جہان تازہ سے روشناس کرتی ہے۔ ہر طرح کی گداگری اور ہر ظلم واستحصال کے خلاف صف بستہ ہونے کی ضرورت کو نظام عالم کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔اس پیغام کی معنویت کو مشرق ومغرب کے جابرانہ نظریۂ مملکت کے پس منظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔اقبال مغلوب قوم کی بے بسی کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ایسے غیر انسانی نظام سے نبرد آزما ہونے کا عزم بیدار کرتے ہیں۔تاکہ انسانی معاشرہ کا مثالی کردار وجود میں آسکے۔

اقبال کا پیغام بنی نوع انسان کے معاشرہ کی تشکیل وتعمیر ہے۔یہی فلاح وفلسفے کا مقصود ومدعا ہے اور حاصل حیات کا معراج بھی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

ڈاکٹر محمد شاہد خان

اقبال کے سیاسی افکار کی تفہیم

اقبال دنیائے ادب میں مفکر، شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی فکری میراث وہ ہے جسے ابتدا میں ہی شانِ کریمی نے موتی سمجھ کر چن لیا تھا، اور ان کی شاعری نوائے پریشان ہے جسے وہ رازِ درون مے خانہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جبکہ فلسفہ تو ان کے آب وگل میں پوشیدہ تھا۔ اسی وجہ سے خدا سے جوانوں کو اپنی فکری نظر بخشنے کی دعا کرتے رہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

اقبال بنیادی طور پر شاعر پیغامبر ہیں، اور اسی وجہ سے فطرت کے بہت قریب تھے انہی فطری تقاضوں کی بنا پر وہ سماج اور سیاست سے بھی فطری وابستگی رکھتے تھے۔ لیکن عملی وابستگی سے بے نیاز تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ شاید انہیں اس دور میں اپنے جیسا کوئی شاعر، فلسفی اور مفکر نظر نہیں آرہا تھا اور دوسری طرف ملک اور قوم انحطاط کا شکار ہوچکی تھی۔ جس کے سبب اقبال کا شعور انہیں بار بار ملک اور قوم کی جانب متوجہ کرتا رہا۔ گویا اپنی بیزاری کے باوجود سماج اور سیاست سے الجھتے رہے۔ سیاست اقبال کا میدان نہیں تھا لیکن حالات اور دوستوں کے اصرار نے علامہ کو سیاست میں قدم رکھنے پر مجبور کردیا۔ اس سلسلے میں جاوید اقبال خود اقبال کی زبانی لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ بقول ان کے کل ہند مسلم سیاست کی دلدل میں ڈھکیل دیئے گئے تھے اور ایسے پھنسے تھے کہ اب نکل سکنا مشکل تھا۔''

اقبال کی طبیعت سیاسی نہیں بلکہ شاعرانہ تھی لیکن سیاسیاتِ حاضرہ سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ جس کے سبب ان کی بیشتر تصانیف سیاست کے حقیقی مفہوم سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ گویا اقبال کی شاعری اور سیاست باہم اس طرح مربوط ہیں جیسے دانتے کی شاعری اور فلارنس کی سیاست۔ اور یہی اقبال کے سیاسی شعور کی فکری اساس ہے۔ جس میں نوع انسان کی سماجی کشمکش، معاشی بحران جیسے بہت سے سیاسی مفہوم کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حالانکہ اقبال کا

سیاسی شعور معاشرت سے ہی فروغ پاتا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ معاشرت جس میں انسانی زندگی کے مسائل ہیں وہ سیاست کے ذریعے ہی حل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی سبب اقبال ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے تھے جو موجودہ قوانین، موجودہ جذبات اور اداروں سے بالکل جدا ہو اور جس کے سب افراد مافوق الانسان کہلانے کے حقدار ہوں۔ اور جن میں خدائے لم یزل کے صفات کی کارفرمائی پوشیدہ ہوگی۔ گویا ان کا ابتدائی موضوع ''انسان'' ہے جس کی ترغیب انہیں قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ سے ملتی ہے تاہم اس عہد میں اقبال کا سیاسی شعور اپنے معاصرین میں تقریباً سبھی سیاست دانوں سے زیادہ پختہ اور مستحکم تھا کیونکہ ان کی تمام سیاسی پیشین گوئیاں مستقبل میں صحیح ثابت ہوئیں ایسے میں مسلمانوں کا اقبال کو اپنا سیاسی رہنمانہ تسلیم کرنا افسوس کے ساتھ حیرت واستعجاب میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن اقبال کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قوم اس عہد میں نیم مردہ ہو چکی تھی۔ اقبال اپنی صدائے پیہم سے قوم کو بیدار کرنے کی سعی کرتے رہے۔ لیکن آج کے دور میں تو ہماری قوم پوری طرح سے مردہ ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے اس بلبلِ نالاں کی صدائیں آج زیادہ پرسوز اور غم انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

گویا اقبال کا سیاسی شعور اپنے عہد کے مقابلے میں زیادہ مؤثر اور پختہ تھا۔ انہوں نے سیاست کے عملی تجربے بھی کیے اور ان کے اس تجربے کا آغاز ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے اسمبلی الیکشن سے ہوا۔ چنانچہ اقبال نے اپنی غیر سیاسی اُفتادِ طبع کے باوجود الیکشن کے ہنگامے میں پڑنے کا فیصلہ کیا؟ اس سلسلے میں نذیر نیازی ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اس لیے کہ عام مسلمانوں کے نزدیک وہ ایک مخلص بے لوث اور قابلِ اعتماد شخص تھے اور اسمبلی میں نمائندگی کے لیے انہیں سیاسی حلقوں میں اقبال سے بہتر آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ۱۹۲۳ء سے ہی لوگ انہیں انتخاب میں حصہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔''

یعنی اقبال کی سیاسی زندگی کو اکثر محققین نے ان کے ارتقائی حیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں علامہ کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے ان کی فکر اور شاعری کو ان کے عہد کے سیاسی نظریات وتحریکات، سوشلزم (اجتماعیت)، نیشنلزم (قومیت) اور جمہوریت کے پس منظر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس وقت دنیائے ادب پر سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط قائم تھا۔ جس کی وجہ سے اقبال کی شاعری میں ان تمام سیاسی نظریات وتحریکات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال نے جابجا اپنے کلام میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے ۔ کیونکہ سرمایہ داروں نے غریبوں کومحکوم ومجبور بنا کران کوان کے حق سے محروم کررکھا تھا۔

ویسے تو سرمایہ دارانہ نظام مغربی تہذیب کی دین ہے۔لیکن آج ہمارے ملک میں سرمایہ داری کا جونظام قائم ہےاس کے ظلم وجبر سے ہرروز نہ جانے کتنے کسان اورمزدور جاں بحق ہورہے ہیں پھربھی کوئی شخص ایسے نظام کے خلاف ایک بھی لفظ بولنے کی جسارت نہیں کرتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام نے لوگون میں خوف وہراس کا ماحول پیدا کردیا ہے۔ایسے ماحول میں جب ہم کلام اقبال پرروشنی ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے علامہ نے یہ اشعار آج کے دور کے لیے ہی کہے ہوں۔مثلاً

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی ، صدیوں تلک تری برات
نسل ،قومیت ،کلیسا ،سلطنت ،تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات

انہی خیال کی بنا پر اقبال کے مارکسی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔جبکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ایک نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' مارکس اورلینن کے نظریہ فکر کوتنقید کا نشانہ بنایا ہے۔لینن موت کے بعد خالقِ کائنات کے حضور پہنچ کر چند سوالات کرتا ہے ۔ یہ سوالات صرف اس عہد کا ہی نہیں بلکہ ہمارے جدید عہد کا بھی المیہ ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

اور پھر لینن کی وہ ازلی حسرت کہ ۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

سوال کا جواب اقبال کچھ اس انداز سے دیتے ہیں ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

دراصل اقبال نے اس نظم میں سرمایہ دارانہ نظام کے اس سربستہ راز سے پردہ اٹھایا ہے جو حقیقتاً معاشرے کی جڑوں میں پیوست تھے۔علامہ اس نظام کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لیے تمام عمر کوشش پیہم کرتے رہے۔چونکہ ان کی فکر کی بنیادی اساس ''توحید'' سے عبارت ہے۔اوراسی فکر کے زیر اثر غلامی واسیری کو مٹایا جاسکتا ہے۔بلاشبہ اقبال سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف تھے۔اوراسی مخالفت کی وجہ سے ہی وہ مارکسی نظریے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ لیکن مارکسی شعور معاشی نظام میں مذہبی روحانیت کا قائل نہیں اور یہی علامہ کے انحراف کی سب سے بڑی وجہ ہے۔اسی سبب اقبال مارکس کو کلیمِ بے تجلی اور مسیحِ بے صلیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔مارکسی نظریہ کے مثبت ومنفی پہلو کے درمیان فکر اقبال کی کشاکش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عہد سرمایہ پرستی کا عہد تھا جو انہیں بہت جلد زوال پزیر معلوم ہورہا تھا۔مثلاً

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

الغرض اردو اور فارسی میں اسی نوع کے بیسوں اشعار موجود ہیں۔جس میں اقبال نے نظامِ سرمایہ داری کے ظلم وبربریت کو نشانۂ ملامت بنایا ہے۔یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے اشتراکی نظام کے متعلق اقبال کا کیا موقف رہا ہے؟ چونکہ بنیادی طور پر اقبال اشتراکیت کے اس نظام پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں جس اشتراکی نظام میں سرمایہ داریت کو اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت ہو۔اسی وجہ سے روس کے اشتراکی انقلاب کے بعد جو نیا معاشرہ معرضِ وجود میں آرہا تھا اس کو اقبال اپنی نظم ''اشتراکیت'' میں اس طرح خوش آمدید کہتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخئ افکار پر مجبور

فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

اسی کے ساتھ اقبال نے ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں روس کی دہریت واضح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ روس ابھی فی الحال لا الہ الا اللہ میں سے صرف ''لا'' کی ہی منزل تک رسائی حاصل کر سکا ہے۔

لیکن وہ وقت قریب ہے جب روس اس منزل سے گزر کر ''الا اللہ'' کے مقام تک پہنچ جائے گا۔مثلاً

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

لا سلاطیں ، لا کلیسا ، لا الہ

فکر او در تند لا بماند

مرکب خود را سوئے ا لا نراند

یہ وجہ ہے کہ روس نظام کہن کو مٹانے کے بعد بھی اس عہد سے لے کر آج تک دنیا میں کوئی عالمگیر وحدت پیدا نہیں کر سکا۔ چونکہ اس عالمگیر وحدت کی اساس اسلام پر قائم ہے۔لہذا اقبال اسی نکتہ کو نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد

یہ پریشاں روزگار ، آشفتہ مغز ، آشفتہ مو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے

جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

الغرض اقبال کی اس قبیل کی جتنی بھی نظمیں ہیں ان کو پڑھنے کے بعد بیشتر ناقدین کو یہ مغالطہ ہو گیا کہ علامہ اشتراکیت کے مبلغ ہیں۔اتفاق سے اس مغالطہ کی شروعات ان کی حیات میں ہی ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس دور کے انقلاب کے سابق ایڈیٹر شمس الدین حسن نے ایک مضمون ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کو روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع کیا جس میں علامہ کو اشتراکی فکر وخیال کا حامی قرار دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اقبال نے ''زمیندار'' کے ایڈیٹر کے نام ایک طویل خط لکھا تھا جس سے علامہ کے نظریۂ اشتراکیت اور اسلامی فکر دونوں کی وضاحت ہوتی ہے۔تاہم بے جا طوالت سے بچنے کے لیے خط کو پیش نہیں کیا جا رہا ہے لیکن اتنا واضح کر دینا لازمی سمجھتا ہوں کہ اقبال کی شاعری اور افکار سے ان کے اشتراکی ہونے کا کہیں بھی کوئی سراغ نہیں ملتا وہ اس قسم کی تحریک کے اسی حد تک حامی ہیں جہاں تک اس کی فکر میں انسانی فلاح و بہبود اور قرآن وسنت کے نشان ملتے ہیں۔

جہاں یہ نشانات گم ہونے لگتے ہیں وہیں سے اقبال اسلامی فکر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو اقبال کی تسکین کا سامان تھا۔

اقبال کے تصور قومیت اور وطنیت (نیشنلزم) کے متعلق ناقدین اور مصنفین کے درمیان دو طرح کی رائے قائم ہے۔ پہلی رائے کے پیروکار وہ لوگ ہیں جو علامہ کو وطن پرست یا قومی شاعر خیال کرتے ہیں اور دوسری رائے کے ماننے والے وہ لوگ ہیں جو انہیں محض اسلامی شاعر مان کر انکے تصور وطنیت کے منکر ہیں۔ اقبال کی حیات اور سیاسی شعور کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا ابتدائی شعور یعنی ۱۹۰۵ء تک وطن پرستی کے دامن سے لبریز تھا۔ جس کے سبب ہمالہ، نیا شوالہ، تصویر درد، ترانۂ ہندی، صدائے درد اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جیسی نظمیں وجود میں آئیں۔ آج ان نظموں کے اشعار ہمارے وطنی شعور کا حصہ ہیں۔

۱۹۰۸ء میں جب ان کا اسلامی شعور سیاسی شکل میں بیدار ہوا تو اس سے اپنا دامن بچا کر راہِ حجاز کا غبار ہو جانے کی تلقین کرنے لگے۔ گویا ''ترانۂ ہندی'' کے بجائے اب ''ترانۂ ملی'' کا ورد ہوا جس کے مخاطب اہل ایماں ہیں۔ اس قومیت اسلامی کی مزید تفصیل اپنی معروف نظم وطنیت (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے، تو مصطفویؐ ہے

گویا اقبال اسلامی شریعت کے مطابق مذہب کے بعد قومیت کے تصور کو تسلیم کرتے ہیں۔ آگے چل کر علامہ سیاسی وطن اور اسلامی وطن کے فرق کو واضح کرتے ہوئے وطن کے سیاسی تصور کو فساد کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح کا اعتقاد رکھنے والی قوم کو آگاہ بھی کرتے ہیں۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے تو اسی سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے تو اسی سے

اقبال کے اس پیغام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آج کے دور کی سیاست کا محاسبہ کریں تو معاملہ بالکل برعکس نظر آئے گا ایسا محسوس ہوگا کہ جھوٹ اور فریب کا نام ہی وطنی سیاست ہے اور جو بھی شخص اس رنگ میں جتنا رنگتا جائے گا وہ اتنا ہی بڑا سیاست داں کہلائے گا۔ حالانکہ سیاست کے لفظی معنیٰ جھوٹ اور فریب کے نہیں ہیں لیکن آج سیاست کا

معنی جھوٹ اور فریب ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ جبکہ اقبال یہاں بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور سیاست کے صحیح مفہوم سے روشناس کراتے ہیں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تما شا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بہر کیف اقبال تصور قومیت کو مسلمانوں کے ایمان کا ایک جز و تسلیم کرتے تھے، کل ایمان نہیں۔ اور یہی بنی آدم کی نشو و نما کا ایک جامع تصور ہے۔ اس لیے مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپی تمام تر خواہشات اور وفا کا مرکز وطن کو بنائے۔

اقبال کے سیاسی نظریات میں ایک نظریۂ جمہوریت کا بھی ہے جس میں علامہ کو اہم مقام حاصل ہے لیکن ایک خاص قسم کی تنقید کے ساتھ، چونکہ اقبال مغرب کے جمہوری نظام سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ جمہوریت بھی استحکام تسلط اور غلبہ عام کی ایک نئی شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے یورپ کے جمہوری نظام، انتخابات، قانون سازی، عدلیہ، انتظامیہ، تعلیم اور آزادئ فکر و عمل کی میراث کو بڑی معنیٰ خیزی کے ساتھ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ اقبال کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ اقبال نے تو اپنی دور بین نگاہوں سے مغرب کے جمہوری نظام کی زوال آمادہ تہذیب کو دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اقبال کو اس طرزِ جمہوریت سے جو شکایت ہے وہ یہ کہ اس میں لیاقت کو نہیں بلکہ مقبولیت کو معیار بنایا جاتا ہے۔ اس لیے علامہ مغربی استعماریت کی ملوکانہ سازش اور ظلم و جبر کو نہایت عمدگی کے ساتھ تنقید کا ہدف بناتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال نظم ''مسولینی'' ہے۔ جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے مسولینی کی بعض خوبیوں کو لائق اعتنا سمجھنے کے بعد بھی وہ اسے فاشزم کے سامراجی نظام کا پیروکار ہی خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو ''مسولینی'' کی زبان پر رکھا ہے۔

جمہوری نظام میں سب سے مقدم ادارہ قانون ساز مجلس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں عوام کے نمائندے تمام طرح کے مسائل پر آزادئ رائے کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال جمہوریت کے اس اصول کو غلط اور حقیقت کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ اگر عوام اپنا حقِ حکمرانی کسی نمائندے کے سپرد کر دیتی ہے تو اس سے اس کا حق چھین لینے کے ذمہ دار بھی وہی ہوتے ہیں۔ اس لیے اقبال عوام کو اقتدار کا سرچشمہ تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے

نزدیک اس طرح کے جمہوری نظام میں بھی وہی پرانی ملوکیت، سوداگری اور استبداد کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ جو قومی تعمیر اور انسانی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے اقبال جمہوری نظام کے اس کھوکھلے پن پر بھرپور تنقید وتعریض کرتے ہیں۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال کے ان اشعار کے مطالعے سے ہمیں کسی طرح کی خوش فہمی یا بدگمانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے ملک میں بھی جمہوری نظام کی کارفرمائی ہے اور آج کا یہ جمہوری نظام زرخرید میڈیا، اخبارات اور بڑے اشاعتی ادارے، سرمایہ داروں کی ملکیت میں ہیں۔ جس کے سبب ادیب اور عالم بھی اس نظام کی استحصالی مشین کا محض ایک پرزہ بن کر رہ جاتے ہیں اسی وجہ سے وہ حق گوئی و بے باکی کی اشاعت کے بجائے گمراہی اور نفرت کو پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ اقبال نے ان فرسودہ جمہوری نظام کے فریب کو بہت پہلے ہی آشکار کر دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار سے ابلیس کی ایجاد

لیکن ان اشعار سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اقبال آزادیٔ افکار کے منکر تھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ایسی آزادی کو ناپسند کرتے تھے جو تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے متصادم ہو جائے۔

الغرض اقبال حکومت اور سیاست کی باگ ڈور کسی نااہل جماعت کے حوالے کرنے کے قائل نہیں بلکہ ذی فہم دانشوران کی آرا کو اجتماعیت پر فوقیت دیتے ہیں۔ جن میں سماج اور ریاست کی فلاح و بہبود کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی صلاحیت ہو نہ کہ عوام کے ذریعہ ناقص شخصی حکومت کو تشکیل دینا جو بذاتِ خود اپنے نجی معاملے میں ناکام و نامراد رہے ہوں۔ جس کی بہترین مثال آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اقبال کے نزدیک اس طرح کی طرزِ حکومت میں تو انسانوں کی اندھی، بہری اور مفلوج لاتعداد بھیڑ جمع تو ہو سکتی ہے لیکن کوئی بہترین حکومت و ریاست معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ ایسی حکومت میں انسانی تعداد کو اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن انسان کے عقل و شعور، فکر و فن، اخلاق و اعمال

کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔اسی لیے اقبال اسلامی طرزِ جمہوریت کے نفاذ کے متمنی نظر آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ موجودہ سیاسی نظریات ،سوشلزم ،نیشنلزم اور جمہوریت کے نظام کو علامہ یکسر فراموش نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک ''نیشنلزم'' کا نظریہ اگر حب الوطنی سے معمور ہے تو ایک مسلمان کے لیے حب الوطنی جزو ایمان ہے اور جمہوریت کی وہ صرف عملی شکل سے بیزار تھے اس کے مثالی تصور کے مخالف نہ تھے۔جبکہ سوشلزم بغیر اجتماعیت کے ممکن نہیں۔اقبال قومی ریاست کو تشکیل دینے کے لیے افراد کی تربیت پر خاصی توجہ صرف کرتے ہیں تا کہ سماج بہترین افراد سے آراستہ ہو کر ایک مثالی ریاست سے آباد ہو سکے۔ان معروضات کو پیش کرنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اقبال کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہے بلکہ اقبال کے پیغام اور سیاسی افکار وخیالات تک رسائی حاصل کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری (مرحوم)

ڈاکٹر اقبال اور رشید احمد صدیقی

(سہیل علی گڑھ کے آئینے میں)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات مختصراً بیان کیے جائیں۔ اقبال کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ یہاں کے اساتذہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور وہ بھی ان کے قدر دان تھے۔ موصوف پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء اور آخری بار ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری لینے کے لیے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ بیچ میں بھی کئی مرتبہ گئے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کو اقبال سے گہری عقیدت تھی۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ صدیقی صاحب ۱۹۲۴ء میں اقبال سے ملنے کے لیے لاہور گئے تھے مسلم یونیورسٹی گزٹ مورخہ ۳/دسمبر ۱۹۲۴ء میں ذیل کی خبر چھپی تھی۔

> ''مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلّیٰ کے سکریٹری مولوی رشید احمد صدیقی ایم اے سر ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک مبسوط تذکرہ لکھ رہے ہیں جن کے ضمن میں انہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا اور بعض متعلقہ امور کی نسبت استفسار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف لاہور گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہاں کے اسلامیہ کالج کے منتظمین کی خواہش پر ۲۵/نومبر ۱۹۲۴ء کو زبان اردو پر لیکچر دیا۔ واپسی میں ۲۷/نومبر ۱۹۲۴ء کو دہلی یونیورسٹی میں اردو زبان کے متعلق جو کچھ ہورہا ہے اس کو یہاں کی انجمن اردوئے معلّیٰ کے لائحہ عمل کو واضح کیا۔ یہ دونوں لیکچر دلچسپی سے سنے گئے۔''

صدیقی صاحب ڈاکٹر اقبال کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں:

''غالباً دن کے دس بجے ہوں گے۔ میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا کپڑے پہن کر

کسی مقدمے کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ
(بو) باندھے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم، چوڑی
چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر
تورانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا مسکرانے میں آنکھوں کے
گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا
۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ
لیے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے۔آپ ہیں جی صدیقی صاحب!

اب تک رشید احمد صدیق صاحب کے نام اقبال کا صرف ایک خط دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط عرصہ ہوا بشیر احمد ڈار مرحوم نے اپنی کتاب ''انوار'' صفحہ ۲۰۲، ۲۰۳ میں شائع کیا تھا۔ اصل خط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ محفوظ ہے۔ اس کا عکس سالنامہ نقوش لاہور شمار نمبر ۱۳۹ صفحہ ۶۶۳ میں درج ہے:

۷ر دسمبر ۱۹۲۹ء

جناب صدیقی صاحب۔ السلام علیکم آپ کا خط مل گیا ہے۔ میری ناقص رائے میں خواجہ حافظ کے شعر میں لفظ ''باد پیمائی'' ہے پہلے مصرعہ میں ''ایں جا'' سے مراد دریں بادیہ ہے مفہوم شعر کا یہ ہے کہ اس دشت میں سیکڑوں ہوائیں بے سلسلہ (یعنی بے زنجیر آزادانہ) رقص کر رہی ہیں اور یہی ہوائیں اے دل تری رفیق (حریف بمعنی رفیق) جب تک تو بادیہ پیما ہے یا ان کا رقص اس غرض سے ہے کہ تو آسانی اور اطمینانی سے اس صحرا کو طے کرنے شاعر کا مقصود اپنے آپ کو تسکین دینا ہے کہ تو بادیہ گردی میں تنہا نہیں ہے بلکہ عالم کا ہر ذرہ تیری ہی خاطر حالت رقص میں ہے حقیقت یہ ہے کہ پہلا مصرعہ بہت بلند ہے اور کسی اور مضمون کا متقاضی ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔
والسلام۔ محمد اقبال حافظؔ کا اصل شعر یہ ہے ؎

صد باد صبا آنجا بے سلسلہ می رقصند
اینست حریف اے دل تا بادیہ پیمائی

اقبال ۱۹۳۴ء میں صدیقی صاحب کی ریڈرشب کے لیے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ایکسپرٹ مقرر کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں سرسید راس مسعود یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار تھے۔ موخر الذکر نے اقبال کو ریڈرشب اور لیکچررشپ کی اسامیوں کے لیے امیدواروں کے کاغذات (Biodata) تقرری کے لیے بھیجے تھے۔ اقبال نے رجسٹرار کے نام ایک انگریزی خط مورخہ ۷ر اگست میں رشید احمد صدیقی کے لیے زبردست

سفارش لکھی تھی۔خط کا عکس ’’نقوش لاہور‘‘ سالنامہ شمارہ نمبر ۱۳۹ میں چھپا ہے۔ذیل میں اس کے ترجمے کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

’’ریڈر شپ کے لیے میں وثوق کے ساتھ رشید احمد صدیقی کے حق میں رائے دیتا ہوں ،ایک ہونہار نثر نگار اور نقاد کی حیثیت سے انہوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ان کی نثر میں ایک خاموش مزاح اور تازگی کا احساس ہوتا ہے جو ان کے ہمعصر نئے لکھنے والوں میں مفقود ہے یہ فیصلہ رشید احمد صدیقی کے حق میں میری ذاتی معلومات کی بنا پر ہے۔میرے خیال میں کوئی دوسرا امیدوار ان کی برابری نہیں کرسکتا۔‘‘

یہ صدیقی صاحب ہی تھے جنہوں نے اقبال کے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کے لیے ایک جرمن خاتون کی سفارش کی تھی۔رشید احمد صدیق نے اردو کا ایک سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ انجمن اردوئے معلّٰی کی طرف سے اپریل ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔رسالہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کی ضخامت اچھی خاصی اور کتابت ،کاغذ بہت عمدہ ہوتا تھا۔پہلے شمارے میں جن لوگوں کے مضامین ہیں ان میں ڈاکٹر اقبال ،صاحبزادہ آفتاب احمد اور عبداللہ چغتائی قابل ذکر ہیں۔

صفحہ ۲ میں علوم اسلامیہ کے عنوان سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کا مضمون ہے صاحبزادہ یونیورسٹی میں اسلامیات کا شعبہ قائم کرنا چاہتے تھے۔صفحہ ۵ سے ۹ تک اقبال کا ایک خط مقالے کی صورت میں صاحبزادہ موصوف کے نام ہے اس میں ان سے یونیورسٹی کے نصاب اور بعض امور کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے اس کے ساتھ صفحہ ۱۵ تا ۲۰ اقبال کا ایک اور مقالہ نما خط ترکی کے مشہور ادیب اور شاعر خالد خلیل کے ایک سوال کے جواب میں ہے۔

سہیل کے شمارہ اول کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اقبالؔ کے مضمون اسلامیات سے پہلے رشید احمد صدیقی نے اپنی طرف سے جو نوٹ لکھا ہے اس مضمون کی غیر معمولی افادیت سامنے آجاتی ہے۔نوٹ یہ ہے:

’’یورپ نے علم وفن میں جو ترقی کی ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں لیکن حقیقت واقعتاً عبرتناک ہے کہ ہم نے خود اپنی حالتوں کے اندازہ کرنے میں اپنے اسلاف کے کارناموں کی اہمیت بالکل نظر انداز ہی نہیں کردی ہے بلکہ ان کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا بھی باعثِ عبث خیال کرلیا

ہے۔حالانکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یورپ کا حال مسلمانوں کے ماضی کا رہین منت ہے لیکن عام طور پر مسلمانوں کی آج کل جو حالت ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے بعض خیر اندیش اور اعتدال پسند طبائع بھی اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ اس وقت ہمارا خضر طریقت صرف یورپ بن سکتا ہے بہرحال کسی طویل اور مفصل بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔بعض ارباب نظر نے تمام امور پر نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہم کو اپنے اسلاف کے علم وفضل ، مذہب واخلاق اور طباعت اور ادب سے دنیا کو روشناس کرانے میں جدید طریقوں کو عمل میں لانا چاہیئے ۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کا ایک شعبہ مسلم یونیورسٹی میں قائم کیا گیا ہے ۔ اپنی مخصوص ضرورت اور نوعیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت محتاج نہیں ہے۔اسلامک اسٹڈیز کا لفظ کہا جاتا ہے کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا وضع کیا ہوا ہے ۔مختلف درسگاہوں میں اس کے نفاذ کا موقع آیا تو ایک دلچسپ بحث یہ اٹھائی گئی کہ اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی ابتدا کس اصول اور کس نوعیت کے ساتھ کی جائے ۔نظر بدآں شعبۂ اسلامیہ اختصاصین کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی ،مولانا مناظر احسن گیلانی (جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کن بھی شریک ہوئے تھے علمائے کرام نے نہایت دل سوزی اور عرق ریزی کے بعد اس مسئلہ کے تمام علمی وعملی پہلو پر نظر رکھ کر نصاب تیار کیا ہے ۔توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ سال سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔ یہ جلسہ کئی اعتبار سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے ہم کو اس رپورٹ کا انتظار ہے۔ بشرطیکہ امکان ۔انشاءاللہ سہیل کی آئندہ اشاعت میں ہم اس کو شائع کرسکیں گے۔ اس سلسلے میں بعض آزادافکار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

جمہوریہ ترکہ نے قسطنطنیہ یونیورسٹی میں بھی اس نوع کی ایک چئر (ادارہ) قائم کیا ہے جس کے معلم اعلیٰ مشہور ترکی ادیب خالد بے قرار پائے ہیں علوم اسلامیہ کے علاوہ اسلامی علم الانساب (جس کی چئر قسطنطنیہ

میں قائم ہوئی ہے) محترم سید سجاد حیدر یلدرم (رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی
گڑھ) کے ایماء سے علامہ سر اقبال نے جس فاضلانہ اور مجتہدانہ انداز سے
تبصرہ کیا ہے وہ اپنا آپ نظیر ہے اور اسی عنوان کے تحت آئندہ صفحات پر
آئے گا۔‘‘

(سہیل جلد دوم نمبر صفحہ ۴۷ جنوری تا مارچ ۱۹۲۷ء)

پیام مشرق کے بعد اقبال کے ایک اور شعری مجموعہ ’’زبور عجم‘‘ کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ صدیقی صاحب نے زیر نظر ’’سہیل‘‘ کے شمارے میں ’’زبور عجم‘‘ کی چند آیات، علامہ سر اقبال کے تازہ ترین افکار کا مجموعہ‘‘ کے عنوان سے زبور عجم کی اشاعت سے پہلے ہی غالباً اقبال نے ارسال کئے تھے۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہیں۔ ؎

ریگ عراق منتظر ،کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ بازدہ کوفہ وشام خویش را
خوش ترز طریق پارسائی
گاے بطریقِ آشنائی

اس شمارے میں ’’غالب اور اقبال‘‘ کے عنوان سے دو الگ الگ نظمیں غالب اور اقبال کے تحت چھپی ہیں۔ دونوں نظمیں ’’زبور عجم‘‘ کے پہلے ایڈیشن سے لی گئی ہیں۔ غالبؔ والی نظم زبور عجم کے دوسرے اور اس کے بعد تمام ایڈیشنوں سے حذف کر دی گئی۔ اقبال والی نظم بغیر کسی عنوان کے صرف چھ شعر میں شامل کی گئی۔ اور یہ اشعار زبور عجم صفحہ ۶۷ میں نمبر ۱۶ کے تحت ملتے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

بجز نے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

ہم ذیل میں سہیل کے زیر نظر شمارہ سے دونوں یادگار نظمیں جوں کی توں درج کرتے ہیں۔

’’غالب اور اقبال‘‘

’’غالب‘‘

بہ پایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہد و فانا بستہ دادم دلستانے را

اجازت داد پیش یک دو حرف از در دل گفتم
پس از دیرے کہ برخود عرضہ دادم دلستانے را
نہ دارم تاب ضبط راز و می ترسم زرسوائی
مگر جویم ز بہر ہم زبانی میزبانے را
بیاد گلشن بختم کہ در ہرگوشہ بینما یم
زجوش لالہ وگل در حنایائے خزانے را
دلم بررنج تا برداری فرہاد می سوزد
خدا وندا بیامرزآں شہید امتحانے را
نشاطِ لذت آزار را نازم کہ درمستی
ہلاک فتنہ دار د ذوقِ مرگِ ناگہانے را
بہ حرنے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را
زمشتاقاں اگر تابِ سخن بردی نمی دانی
محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را
کجا نورے کہ غیر از قاصدے چیزے نمی داند
کجا خاکے کہ در آغوش دارو آسمانے را
اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجودِ من
بہ ایں قیمت نمی گیرم حیات جاودانے را
من اے دریائے بے پایاں بہ موج تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نمی جویم کرانے را
ازاں معنیٰ کہ چوں شبنم بجان من فروریزی
جہانِ تازہ پیدا کردہ ام عرض فغانے را

سید غلام سمنانی (مرحوم)

مسجد قرطبہ کی واپسی

(ا)

ہے نگہ اشتیاق محو تماشا ئے ذات	توڑ دئے عشق نے عقل کے لات ومنات
عشق ہے فتح مبین عشق ہے نور یقین	عشق غیور ومتین عشق ہے صبر وثبات
عشق کا سوز نفس گرمیٔ بازار عشق	عشق کا اشک رواں دجلہ ونیل وفرات
کوہ کن وقیس ہیں بندۂ بے دام عشق	عشق رئیس الکرام عشق امیر الثقات
عشق ہے مہر منیر عشق سے روشن ہوئیں	تیرہ و تاریک تھی...انجمن کائنات
جنبش ابروئے عشق جنبش بال قضا	فتنۂ یوم نشور عشق کی ادنی سی ذات
مٹ گئی اک آن میں کشمکش جسم وجان	اٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات وصفات
وسعت دشت طلب عشق کو فرمان جان	عیشِ غم جاوداں عشق کو شاخ نبات
مرحلۂ عشق میں خار الم کی بدوش	میکدہ عشق میں زہر ہے آب حیات
عشق کی تقدیر ہے آتش و خون دارو گیر	عشق کو پیش آئے ہیں ایسے بہت سانحات
عزم وعمل کے لئے کچھ نہیں ارض وسما	عزم وعمل کے لئے کچھ نہیں یہ شش جہات
زیر قدم آگیا خیمہ عرش بریں	ہو گئی ہے ریز ریز شیشہ گہ ممکنات
میرے جنوں کا صلہ مملکت تحت وفوق	عقل زیاں کوش ہے میرے جنوں کی زکات
مجھ پہ ہوئے منکشف لوح وقلم کے رموز	پوچھ لے مجھ سے کوئی راز حیات وممات
شاطر تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی	دیکھتے ہی دیکھتے کھاگئی تدبیر مات
کتنے دنوں پر ملا عشق کو اذن سجود	پھر وہی جوش اذان پھر وہی لطف صلوت

چشم تمنا میں ہے حسن سرا پائے دوست
سامعہ افروز ہے لذت آدائے دوست

قافلہ وقت ہے گرم رو وتیز گام	کس کے لئے ہے قعود کس کے لئے ہے قیام
کمترک از برگ خشک کمترک از ریگ دشت	وقت کے صحرا میں یہ شام وسحر کے خیام

وقت کے دریا کی موج جوش طوفان بدوش وقت کا ساحل نہیں اسکا نہیں ہے مقام
وقت کے تپش سے آب زہرہ فولاد وسنگ کوشک وایوان وکاخ قصرودرو سقف وبام
وقت کی تیغ اصیل وقت کی شمشیر تیز بے جگر وبے خطر خبر وبے نیام
وقت کے محکوم ہیں قیصر وخاقان ومیر خواجہ وشاہ وسپاہ وقت کے ادنی غلام
وقت سکون ناشناس وقت ہے شورش اساس وقت کا ز ہوارہے تند روبے زمام
مرغ بلند آشیان اسکا اسیر فریب وقت کا صیاد ہے تیز نگہ تنگ ودام
وقت کے معبد ہیں سب محور کوع وسجود وقت کے سب مقتدی وقت ہے سب کا امام
کس کو ملی ہے یہاں رخصت اظہار شوق کس کو ملی ہے یہاں فرصت عیش دوام
خواب پریشان سے کم آرزوئے دل نہیں خواہش عیش دوام ایک تمنائے خام
وقت کی اک آن ہیں ماضی وفرد او حال وقت کی اک شان ہے انجمن صبح وشام
وقت عظیم وجلیل وقت محیط وبسیط وقت کو کچھ مت کہو یہ ہے کسی کا پیام
وقت ہے درمان درد وقت دم گرم وسرد وقت ہی خود زخم ہے وقت ہی خود التیام

وقت نہیں ہے حدود وقت نہیں ہے ثغور اسکی بھی ہے انتہا اس کا بھی ہے اختتام
وقت ہے سیل روان عشق ہے کوہ گراں وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام
عشق ازل آشنا عشق ابد اختیار
عشق ہے دار البقا عشق ہے دار القرار

اب نگہ شوق میں غیب ہے عین شہود راز کہاں رہ گیا عالم بود و نبود
شاہد تقدیر نے رخ سے الٹ دی نقاب پھر وہی ذکر جمیل پھر وہی گفت وشنود
عشق پہ تیری بنا عشق سے تیرا خمیر ہے یہی راز دوام ہے یہی راز خلود
نقش ترا لا زوال نقش تیرا بے مثال کام تو کچھ کر گیا عشق کا ذوق نمود
جس کے تھے قلب ونظر جلوہ شناس ازل تھا وہ یہ کہنا ترا نقش طراز وجود
جس کے ہنر نے کئے جمع بحسن وکمال کسوت تہذیب کے بکھرے ہوئے تارو پود

جس کو بہا لے گیا ساحل مقصود تک　　لجۂ بحر عطا موجۂ دریائے جود
جس کی امیری سے تھا حسن فقیری عیاں　　جس کی نگاہوں میں ہیچ خوف زیاں اور سود
راز کے بند قبا کھل گئے اک آن میں　　عقدۂ مشکل کی تھی جس سے کشاد وکشود
اس کی نگہ دلکش و اس کی ادا حق نما　　کتنے ہی فتنے اٹھے زیر سپہر کبود
بزم گہ ناز میں جلوہ فزائے کرم　　رزم گہ کار میں ہوش ربائے جنود
زورق وطوفان شکن مرد زن وجان شکن　　قیصر وخاقان شکن اس کا قیام ودرود
جس کا خیال وعمل باعث تجدید شوق　　جس سے کہ توڑا گیا مغربیوں کا جمود
خلوت وجلوت میں تھا نقش گر صد یقین　　اس کا قیام وقعود اس کا رکوع وسجود
اس کا امین عطا شاہد تہذیب وفن　　اس کی رہین کرم کار گہ دیر وزود
کتنے دنوں تک رہا ساز نوائے خروش　　کتنے دنوں تک رہی مخفی جاں بے سرود

اک نئے عنوان سے جنبش بہاراں ہوا
جشن بہاراں ہوا رقص نگاراں ہوا

تیرے ہر اک سنگ میں نور دل جبرئیل　　تو ہے عدیم النظیر تو ہے عدیم المثیل
تیری ہر اک خشت میں خون رگ دلبری　　تیرا ہر اک پیچ وخم رقص گہ سلسبیل
منبر ومحراب ودریہ ترے نقش ونگار　　مصدر خیر کثیر مرکز اجر جزیل
تیری بلندی سے پست رفعت چرخ بریں　　تجھ سے ہوا فرش خاک کتنا عظیم وجلیل
جن کی بہار وں سے فاش راز بہار ارم　　تیرے وہ گلزار وباغ تیری وکشت نخیل
حکمت تعمیر کو تجھ سے ملی آب وتاب　　حکمت تعمیر کا تیری نہیں ہے عدیل
وسمہ ابروئے زیست ہے ترا دود چراغ　　تیری کف خاک سے دیدۂ مغرب کحیل
شمع رہ دین بنی ظلمت مغرب میں تو　　علم وہنر کے لئے تیری بنا سنگ میل
مجھ کو ہے معلوم تھا کون وہ آذر ترا　　آہ وہ فرد فرید آہ وہ مرد نبیل
مرحلۂ حق میں تھا صبر و رضا کا نقیب　　جس سے ہوا آشکار سیر ذبیح وخلیل
اس کا عمل اس کا عزم اس کا حشم اس کا حزم　　چشم جہاں کے لئے ایک کتاب الدلیل
جس کی زرہ لاالہ جس کی پنہ لاالہ　　جس کے لئے کچھ نہیں تیغ وسناں اسپ وفیل

عرصۂ پیکار میں قلزم ذخار میں　　کچھ نہ رہا کیف وکم کچھ نہ رہا قال وقیل
بن گیا مضراب جاں بن گیا مہمیز شوق　　وہ بھی نہیں مستحیل تو بھی نہیں مستحیل
پھر ہے وہی رستخیز پھر وہی شور ستیز　　تازہ نہ ہوجائے پھر قصۂ فرعون ونیل

ضرب کلیمی بھی ہے اور ید بیضا بھی ہے
ساحر عصر جدید تونے یہ دیکھا بھی ہے

(مسجد قرطبہ واگذشت ہونے کی خبر سے متاثر ہوکر سید غلام سمنانی مرحوم نے یہ قلم بند کی تھی۔)

مبصر: ڈاکٹر محمد شاہد خاں
شعبہ اُردو الہ آباد (یوپی)

اقبال کی فکری سرگزشت

(ابتدائی دور)

زیرِ نظر تبصرہ کتاب پروفیسر عبدالحق کی پہلی ادبی کاوش ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پروفیسر عبدالحق کے دہلی یونیورسٹی میں تدریس سے وابستہ ہونے کے دو سال بعد یعنی ۱۹۶۹ء میں عمل میں آئی۔ پروفیسر عبدالحق اس کتاب کے معروضات میں اس کی وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صاحب کتاب بننے کی خواہش بے جا اور روزگار کے حرص وہوس نے شوق پیدا کیا۔'' لیکن میں اسے بے جا اور روزگار کے حرص وہوس سے تعبیر نہیں کرتا۔ بلکہ پروفیسر عبدالحق کی اعلیٰ ظرفی سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ روزگار کی تلاش کرنا اور ضروریات روزگار کی اہلیت کو مکمل کرنا فعلِ لازم ہے۔ کیونکہ جب تک آپ کسی عہدے کے اہل ہی نہ ہوں گے تو اس عہدے پر آپ کا تقرر کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کو حرص وہوس کا حصہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ حرص وہوس خانہ پوری کی ایک شکل ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کسی کتاب کا مقبولِ عام ہونا بہر حال ممکن نہیں۔ جبکہ اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ برصغیر ہندو پاک کے کئی اداروں سے اس کی دوسری اشاعت کے لیے بار ہا اصرار کیا تھا۔ لیکن پروفیسر عبدالحق کی مصروفیت کے سبب اس وقت اس کتاب کی دوسری اشاعت عمل میں نہ آسکی۔ تاہم پورے پچاس برس کا ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اس کتاب کی دوسری اشاعت آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ مباحث اور مندرجات کا حامل ہے یہ علمی ریاضت کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہے جو اقبالیات میں بہت محترم ہے اور مقتدر بھی ہے۔

پروفیسر عبدالحق کی وہ کتابیں جو اقبالیاتی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن کمیاب ہیں ان کی اشاعت بھی عمل میں آنی چاہئے۔ جس سے اقبالیاتی ادب سے منسلک نو وارد طلبہ کو مزید فائدہ حاصل ہو سکے۔

''اقبال کی فکری سرگذشت'' کی پہلی اشاعت میں جو غلطیاں راہ پا گئیں تھیں۔ دوسری اشاعت میں ان کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی صورت کتاب کے نام کی تبدیلی ہے۔ پہلی اشاعت میں اس کتاب کا نام ''اقبال کے ابتدائی افکار'' تھا۔ لیکن ترمیم کے بعد کتاب کا نام ''اقبال کی فکری سرگذشت'' (ابتدائی دور) کر دیا گیا۔ اسی ترمیم

واضافے کے تحت چند نئے باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جو قابلِ صد تحسین ہے۔ حالانکہ پروفیسر عبدالحق کا اقبال شناسی کے میدان میں یہ پہلا تجربہ تھا۔اس تجربے کی اہمیت پروفیسر عبدالحق کی زندگی میں مشعلِ راہ کی سی ثابت ہوئی۔ یہیں سے پروفیسر عبدالحق کی زندگی کی شمع روشن ہوتی چلی گئی اور آج اس روشن شمع کی روشنی سے نہ جانے کتنے لوگ، کتنے ادارے، کتنے رسائل وجرائد، کتنی محفلیں، اقبالیاتی ادب کے شہ پارے اور نہ جانے کتنے ادب پارے اردو کے ادبی افق پر روشن ہیں۔ یہ سب اقبالیاتی ادب کے فیضان کا ثمرہ ہے۔اسی لیے اردو ادب کی تاریخ میں پروفیسر عبدالحق کی شخصیت ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے معروف ہے۔اس صداقت کی ابتدائی ضامن زیرِ نظر تبصرہ کتاب ہے۔ساتھ ہی پروفیسر عبدالحق کی یہ وہ کتاب ہے جسے آزاد ہندوستان کا پہلا تحقیقی مقالہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اس کی اہمیت صرف آزاد ہندوستان کا پہلا مقالہ ہونے کے سبب نہیں بلکہ تحقیق وتنقید کا استدلال اندازِ بیان ہے۔ یہ کتاب بہ ظاہر تنقیدی ہے۔مگر تنقید کو تحقیق کے بھر پور ضابطوں سے ہم آہنگ کیا گیا ہے جو اقبالیات ہی نہیں ہمارے تنقیدی ذخیرہ میں ایک امتیاز اور انفرادیت رکھتی ہے۔کتاب حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ پھر تعلیقات نے اس تصنیف کو علمی وقار بخشا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون تفکیری امتیازات ہے۔اس مضمون کے تحت پروفیسر عبدالحق نے اقبال کی فکر کے ابتدائی سرچشموں کی پرواز کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اس فکر سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے چند سوالات بھی قائم کیے ہیں۔ جیسے فکر اقبال کے امتیازات کیا ہیں؟ ان کے اسلوبِ فکر کا انداز کیا تھا؟ کس طرح ان کی فکر نے ابتدائی منزلیں طے کیں؟ ان میں کتنے اور کس طرح کے سنگ، راہ حائل ہوئے اور اقبال کا کاروانِ فکر کن مرحلوں سے منزلِ مراد تک پہنچا؟ اقبال کا فکر وفلسفہ کے متعلق کیا نقطۂ نظر تھا؟ اور کس سلسلۂ فکر سے ان کا تعلق رہا؟ یہی وہ چند بنیادی سوالات ہیں جس کے تحت اقبال کے فکر کی صحیح تعبیرات کو پیش کرنے کوشش کی گئی ہے۔ان کے مطالعے سے پروفیسر عبدالحق کی محنت شاقہ اور بصیرت افروزی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کتاب میں ان مصنفین کی آرا کو بھی پیش کیا گیا ہے۔جنھوں نے اقبال کی فکر سے اختلاف کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان تمام مصنفین کی اختلافی آرا کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے۔گویا تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ان تمام خیالات کی حقیقت صرف ایک گمراہ کن نظریے کی رہ جاتی ہے۔ یہی اصولِ تنقید بھی ہے کہ ہر طرح کے نکات پر اختلافات واعتراضات کا حکم صادر کرتے وقت انصاف کے میزان کی دوڑ ہاتھ سے نہیں چھوٹنی چاہئے۔ ورنہ گمراہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ چنانچہ پروفیسر عبدالحق نے تحقیق وتنقید کے اصول کو اس طرح اپنے اسلوب کے قالب میں بھی ڈھال دیا کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔اور یہی اس کتاب کی بنیادی خصوصیت بھی ہے۔آج کی تحقیق وتنقید عقیدت مندی کا گہوارہ بن گئی ہے۔ کیونکہ جو

تحقیق کبھی حق و باطل کی شناخت کا مسئلہ پیش کرتی تھی وہ آج خود ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔یہی حال آج کی تنقید کا بھی ہے اس میں تعینِ قدر کا پرتو تو نظر نہیں آتا۔البتہ گمراہ کن دعوے ضرور راہ پا گئے ہیں۔اس پر طرہ یہ کہ عقیدت مندی کا رنگ و روغن بھی چڑھا دیا گیا ہے۔جبکہ تنقید میں عقیدت مندی زہر ہلاہل کے مترادف ہوتی ہے۔حالانکہ پروفیسر عبدالحق کا تنقیدی اسلوب عقیدت مندی کے عیب سے پاک ہے۔کیونکہ پروفیسر عبدالحق نے تنقیدی بصیرت کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہی انتقاد اور احتساب کی محبوب رہ گزر بھی ہے۔چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''اس تالیف میں انتقادی مباحث سے تعارض و تائید دونوں کو تنصیف کے ترازو پر آزمایا گیا ہے۔راقم نے اقبال کے کلام کی مدد سے ایک واضح اور پر وقار تصویر پیش کی ہے جو متون کے معنی و مفہوم پر منحصر ہے۔انتقاد میں متن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔''

اسی اندازِ اسلوب کو پوری کتاب میں روا رکھا گیا ہے اور یہی امر اس کتاب کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے جملہ مضامین قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ان کے مطالعے سے قاری اقبال کی ابتدائی فکر سے پوری واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اقبال کی فکری ارتقا کی منزلیں کس طرح سے پرواز کرتی ہیں اور دھیرے دھیرے کیسے پورے عالم ادب پر چھا جاتی ہیں۔اس کا بھی ادراک حاصل ہو جاتا ہے۔چونکہ اس کتاب میں اقبال کی فکر کا بہتا ہوا ایک تسلسل ہے۔اس لیے قاری اس فکری دھارے سے خود کو جوڑنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے۔جس کے سبب اس کی فکری جہات میں ایک انفرادی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔یہ انفرادی کیفیت گمراہی کی نہیں بلکہ بیداری کی ہے۔گویا یہ اقبال کی فکری پرواز کا نتیجہ ہے۔جس کو پروفیسر عبدالحق نے اپنی اس کتاب میں واضح طور پر پیش کیا ہے۔چنانچہ کتاب دو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ایک تو اقبال کے ابتدائی فکر کی نہایت اہم کڑی ہونے کے سبب اور دوسرا تحقیق و تنقید کا اندازِ اسلوب۔امید ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔